فن اور شخصیت
فن اور شخصیت

فہرست

کلامِ ندیم

اداریہ

دورِ حاضر میں ہندوستان کے مختلف خطوں میں علاقائی تحقیق کا جو احساس بیدار ہوا ہے وہ یقیناً علم و ادب کے سمندر کی تہوں میں پوشیدہ انمول دُرِ دانوں کو ڈھونڈھ لائے گا۔ اور خاص طور سے راجستھان کے عظیم صحرا کے بیشمار ٹیلوں کی بھول بھلیوں میں گم نخلستان مل جائیں گے جن سے محققین کے سیراب ہونے کی پوری پوری توقع کی جا سکتی ہے۔

آج کا محقق جب علم و ادب کے کھنڈرات کی تلاش کے لئے کھدائی کرتا ہے تو وہ اس دور کے عالی شان محلات کے علاوہ ایسے گمنام ادبی گوشوں کو بھی کھوج نکالتا ہے جن کی بے لوث ادبی خدمات ان کی خاموش ادب نوازی کے سبب منظرِ عام پر نہیں آسکی ہوں۔ لیکن ایسے ادبی ذخیرے دستیاب ہو جاتے ہیں تو وہ آج کے دور میں دُرِ نایاب ثابت ہوتے ہیں۔

راجستھان میں تحقیقی کارفرمائیوں سے جو ادبی مواد مجموعی طور سے فراہم ہو رہا ہے۔ وہ بلاشبہ نئے محققین کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگا۔ اس طرح کا مواد فراہم کرنے کے سلسلے ہی ان شخصیات کا تعارف کرانا ہمارا فرض ہے جنھوں نے ذات پات اور مذہب سے بالاتر ہو کر اردو زبان و ادب کی خدمات انجام دی ہیں۔

راجستھان کی ایسی شخصیتوں میں آنجہانی ماسٹر رام نواس ندیم کا اسم گرامی بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے ندیم صاحب ایک شاعر اور نثار ہی نہیں تھے بلکہ ٹونک کی ادبی دنیا میں بذاتِ خود ایک انجمن تھے۔ علم و ادب کے گہوارے شہر ٹونک کے اس لاجواب فن کار کی ادبی صلاحیتوں اور فنی خدمات کو صوبائی سطح پر منظرِ عام پر لانے کے لئے ہم ندیم نمبر شائع کر کے آنجہانی ندیم کو خراجِ تحسین پیش کر رہے ہیں۔ موصوف کے ادبی ذخائر میں سے جو بھی دستیاب ہو سکا۔ ہدیہ ناظرین ہے۔

شمارہ کا آغاز ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج ٹونک کے مضمون "آئینۂ تاریخ میں تصویرِ ندیم" سے ہوا ہے جس میں عثمانی صاحب نے ہندوستان کی تاریخ ادب اردو میں غیر مسلم حضرات کی ادبی کاوشوں کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے ادب میں حضرت ندیم کا درجہ متعین کیا ہے۔

جناب مولانا سید عبدالقادر خنداں صاحب نے ندیم کی یاد میں ، ان کے جذبۂ اخوت اور انسان دوستی کے جذبے کو اجاگر کیا ہے۔ اور ان کی شاعرانہ اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

جناب محمد صادق صاحب بہار ٹونکی نے ندیم صاحب کی تدریسی خدمات اور شاعرانہ خصوصیات کا جائزہ لیا ہے اور دیگر مصنفین کی تخلیقات کے آئینہ میں حضرت ندیم کی فن کارانہ تصویر دکھانے کی جا بجا کوشش کی ہے۔

جناب ہونہار سنگھل نے "یادوں کے چراغ" جلا کر ماضی کے جھروکوں کی ایک ناقابل فراموش تصویر کھینچی ہے

جناب عزیز اللہ شیرانی نے حضرت ندیم کی ادبی خدمات تہذیب و روایت کی روشنی میں پیش کی ہیں اور اس دور کی مروجہ روایات کے پیش نظر اصناف سخن کی خصوصیات اور ندیم کے کلام میں شاعرانہ نظریات کا اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

جناب مراد سعیدی صاحب نے "آہ ندیم" کے عنوان سے نظم لکھ کر ندیم کی ادبی خصوصیات کے ساتھ ساتھ ان کے تئیں اپنی عقیدت اور انسیت کا اظہار فرمایا ہے۔

جناب قاری سلیم اللہ صاحب و آصف فرقانی نے اپنی نظم "آئینۂ ندیم" (در صنعت توشیح) میں آنجہانی ماسٹر رام نواس جی ندیم کے اسم گرامی میں شامل تمام حروف کے الگ الگ اشعار کہہ کر ان کی علمی قابلیت، ادب دوستی اور اعلیٰ رتبے کی نشان دہی کی ہے۔

راقم الحروف نے اپنے مضمون "ندیم ایک فن کار" میں عروضی آئینہ میں ندیم کی فنکارانہ صلاحیتوں کا جائزہ لے کر ان کی علم عروض پر دسترس کو تسلیم کیا ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ وہ ہر طرح ایک کامیاب ترین شاعر کہلانے کے مستحق تھے۔ حضرت ندیم کی اعلیٰ اردو ادبی خدمات کو منظر عام پر لانے کے لئے ان کا منتخب کلام (غزلیں، نظمیں، قصیدے، سلام، تہنیت نامے، حمد، نعت) زیر نظر شمارہ میں ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے۔ اور اسی کے ساتھ حضرت ندیم کے نثری مضامین میں سے صرف ایک مضمون جو ہمیں دستیاب ہوا ہے شامل اشاعت ہے۔

آنجہانی ندیم کی اعلیٰ اردو ادبی خدمات کی روشنی میں یہ خاص نمبر نکالتے ہوئے ہم امید کرتے ہیں کہ آج کل دور کے محققین اس سے مستفید ہوں گے اور تشنگان ادب اس سرچشمہ سے ضرور سیراب ہوں گے۔

قیصر رشید بھارتی۔

ڈاکٹر ابو الفیض عثمانی۔

تصویر ہند بہ آئینۂ تاریخ میں

اردو زبان کی تعمیر و ترویج اور اس کے ادب کی ترقی و اشاعت، نہ کسی مخصوص فرقے اور طبقے کی مرہونِ منّت ہے، نہ کسی خطّے اور علاقے کی۔ اس زبان نے نہ صرف شیخ و برہمن کو اتحاد کے رشتے میں منسلک کیا۔ بلکہ ہندوستان جیسے عریض و بسیط ملک کے مختلف صوبوں اور علاقوں میں لسانی مغائرت کے باوجود یگانگت کا جوہر پیدا کیا۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اردو زبان و ادب کے چمن کی آبیاری بلا تفریقِ مذہب و ملت ہر دور میں ہر خطّے اور ہر علاقے میں ہوتی رہی ہے۔

اردو زبان اپنے دورِ آفرینش میں پنجاب، دہلی، اور شمالی ہند میں اور اس کے دوسرے علاقوں میں بول چال کی حد تک محدود رہی۔ دکن پہنچتے پہنچتے صوفیائے کرام کی سرپرستی میں تحریر سے روشناس ہوئی۔ اور قطب شاہی و عادل شاہی حکمرانوں کی سربراہی میں ان کے درباروں کو شعر و سخن کی محفلوں سے گرما کر ادبی دنیا میں آگے بڑھنے لگی۔

اس زمانے میں ہندوستان پر خاندان مغلیہ کا اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ جن کی سرپرستی میں فارسی زبان کو شمالی ہند میں ایسا ادبی وقار حاصل ہو چکا تھا۔ کہ کوئی دوسری زبان اس کی ہمسر نظر نہیں آتی تھی۔

اسی خاندان کے آخری دورِ حکومت میں جب ولی دکنی کے ذریعہ اردو زبان کی لسانی لطافت اور ادبی صلاحیت کا شہرہ دکن سے شمالی ہند میں پہنچا تو بڑے فارسی گو شعراء نے اس کو اپنایا۔ اور اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں میر و سودا نے اپنی شعری تخلیقات کے ذریعہ اردو کو فارسی کا نعم البدل ثابت کر دیا۔ اور اس کی شیرینی اور لطافت و سلاست نے اہل دہلی کے دلوں کو اس طرح موہ لیا۔ کہ ادبی اعتبار سے دہلی کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی اور وہاں کے شعراء اور اہل قلم نے اس زبان کو ایسا نکھارا اور سنوارا۔ کہ دہلی کی زبان ٹکسالی سمجھی جانے لگی۔

جہاں ایک طرف اردو کے چراغ کی لو تیز ہونے لگی تھی وہاں دوسری جانب مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرنے

لگا تھا۔ سلاطینِ وقت کی کمزوری اور نااہلی کے باعث دہلی، حملہ آوروں کی غارت گری کا نشانہ بنی ہوئی تھی جس نے زندگی کا سکون برباد کر دیا تھا۔ نہ جان و مال کی حفاظت تھی نہ عزت و ناموس کی۔ مزید برآں یہ کہ وسائل معاش محدود تر ہوتے جا رہے تھے۔ ایسے حالات میں اہل دہلی ترک وطن پر مجبور ہونے لگے تھے۔ اور وہاں کے ارباب علم وفن اور دوسرے لوگ ایسے مقامات کی تلاش میں نکلنے لگے تھے جہاں ذہنی سکون اور معاشی اطمینان میسّر ہو سکے۔

اسی زمانے میں مرکزی حکومت کی ناپائیداری سے فائدہ اٹھا کر مختلف صوبوں کے حاکم اور صوبے دار شاہی اطاعت سے منحرف ہو کر علم خود مختاری بلند کرنے لگے تھے ایسے ہی صوبوں میں اودھ بھی شامل تھا جس کا دارالخلافہ فیض آباد تھا وہاں کے شیخ زادوں کی سرکوبی کے لئے نصیر الملک کو بھیجا گیا تھا انھوں نے ایسا اقتدار قائم کیا۔ کہ ان کا خاندان کئی پشتوں تک نہایت شان وشوکت کے ساتھ سلطنت اودھ پر قابض رہا۔

ان کے دولت کی فراوانی تھی، طبیعت میں فیاضی تھی، اور ادب اور فنونِ لطیفہ سے دلچسپی تھی۔ ان ہی خصوصیات نے دہلی کے فنکاروں اور شاعروں کو فیض آباد کی جانب متوجہ کیا۔ اور آہستہ آہستہ لوگ دہلی سے فیض آباد پہنچنے لگے۔ جہاں شاہی سرپرستی میں ان کو سکون نصیب ہوا۔ اور شجاع الدولہ بہادر کے عہد حکومت میں فیض آباد ایک ادبی گہوارہ نظر آنے لگا۔ مگر ان کی نفاست پسند طبیعت وہاں کی قدیم شہری تعمیر کی متحمل نہ رہی اور تھوڑے ہی عرصے میں انھوں نے لکھنؤ کو آباد کر کے اسے اودھ کا دارالخلافہ بنا دیا اور وہاں تہذیب و تمدن کا ایسا چراغ روشن کیا جس نے تمام دنیا کو اپنی ادبی روشنی سے چکا چوند کر دیا۔

لکھنؤ کے حکمرانوں کی فیاضی، ادب نوازی اور فنون لطیفہ کی سرپرستی کے باعث تہذیب و تمدن کی عظمت و وقار کے ساتھ وہاں شعر و ادب کو وہ عروج حاصل ہوا جس نے لکھنؤ کو اردو شاعری کا ایک انفرادی گہوارہ بنا دیا۔ وہاں کے شعراء نے زبان و بیان اور الفاظ و محاورات کی تراش خراش سے اردو زبان کو ایسا نکھارا اور سنوارا۔ کہ مغرب کے دیس سے آنے والے انگریز اس زبان کو ہندوستان کی واحد علمی و ادبی زبان اور پورے ملک کی لنگوا فرینکا سمجھنے لگے۔

چنانچہ اٹھارھویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے جب ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا سیاسی اقتدار بڑھنے لگا۔ تو فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں اپنے ملک والوں کے لئے اسی زبان کی تعلیم کا انتظام کیا۔ اور اسی کے ذریعہ اپنی مذہبی تبلیغ کا کام لیا۔

انیسویں صدی میں جب ان کے اقتدار کے آفتاب کی روشنی تیز ہوئی۔ تو ۱۸۳۲ء آتے آتے انھوں نے اسی زبان کو اپنے دفاتر کے کاروبار میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ اردو شعر و ادب پر بھی توجہ کی۔ چنانچہ انھیں میں صاحب دیوان شاعر بھی ہوئے۔

انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے دیسی ریاستوں کو اپنی سیاسی سازشوں کا نشانہ بنایا۔ اور آہستہ آہستہ ان کے حکمرانوں سے سیاسی عہد و پیمان کر کے انھیں اپنا مطیع بنا لیا۔ جس نے اطاعت سے انکار کیا۔ اس کے ساتھ وہی حشر ہوا۔ جو مہاراجہ بھرت پور کو برداشت کرنا پڑا۔ جہاں ڈیگ کے تاریخی قلعہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔

اسی کے ساتھ ساتھ اپنے اقتدار کے استحکام کے لئے نئی ریاستیں بھی قائم کرائیں چنانچہ راجستھان میں ریاست جھالاواڑ، ریاست ٹونک، اور پنجاب میں ریاست فیروز پور جھرکہ مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔

اس عرصہ میں انگریزوں کی فوجی طاقت اس قدر بڑھ چکی تھی۔ کہ جب بادشاہِ وقت ہی ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر کے رحم و کرم کا امیدوار رہنے لگا تھا۔ تو پھر مختلف صوبے داروں کی ان کی نظر میں کوئی وقعت نہ تھی۔ بنگال پر تو ان کا قبضہ ہو ہی چکا تھا۔ اب دوسرے صوبوں پر بھی نگاہیں پڑنے لگی تھیں۔ جہاں تھوڑی سی کمزوری نظر آتی تھی۔ انگریزی اقتدار کا جھنڈا لہرانے لگتا تھا۔ صوبۂ اودھ ان کی للچائی ہوئی نظروں کا نشانہ بن چکا تھا جہاں مال و دولت کی گنگا جمنا بہہ رہی تھیں۔ اور عیش و عشرت کا دور دورہ تھا عوام سے خواص تک ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ دن عید اور رات شب براءت تھی۔

تہذیب کے اس مرکز اور شعر و سخن کے اس گہوارے کے آخری فرماں روا، نواب واجد علی شاہ اختر کو اپنی حکمت عملی سے معزول کر کے وہاں کا شیرازہ ایسا منتشر کر دیا۔ کہ اربابِ علم و فن در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو گئے اور تلاش معاش کی فکر میں ادھر ادھر جانے لگے۔

اس کامیابی نے انگریزوں کے حوصلے اور بڑھائے۔ ان کی نظر دہلی کی سلطنت پر تھی۔ جہاں بادشاہ کی حکومت گھٹتے گھٹتے شہر کی چار دیواری تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ شاہی دربار ہی نہیں۔ بلکہ محل سرا تک سیاسی سازشوں کے جال میں پھنسا ہوا تھا۔ برائے نام بادشاہ ذہنی سکون کا متلاشی تھا۔

بہادر شاہ ظفر کو قدرت نے شعر و ادب کے ذوق کا فطری جوہر عطا کیا تھا۔ خزانہ خالی تھا۔ مگر اس

کی طبیعت کی فیاضی نے علم پروری اور ادب نوازی کا ایسا ثبوت دیا کہ دہلی میں ایک بار پھر شعر و سخن کی شمع کی لو تیز ہو گئی اور شاہی دربار، شعراء، ادباء اور اہل علم کا ملجا و ماویٰ بن گیا۔ اور ذوق، مومن اور غالب نیز ان کے تلامذہ نے دہلی کے ادبی وقار کو از سر نو چار چاند لگا دیئے۔ مگر یہ سب کچھ وقتی حالات ثابت ہوئے اور ۱۸۵۷ء کے غدر کے ایک ہی جھونکے نے جہاں ایک طرف سلطنت مغلیہ کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو گل کر دیا وہاں دوسری جانب دہلی کے ادبی شیرازے کا ورق ورق منتشر کر دیا۔

چنانچہ جس طرح خزاں رسیدہ درخت کے پتے ہوا کے جھونکوں سے بکھر کر دور دور تک پہنچ جاتے ہیں اسی طرح دہلی کے شجر ادب کے برگ و بار کو غدر کی باد خزاں نے تاراج کر کے دور دور تک پہنچا دیا۔

اردو شعر و ادب ان تمام حالات سے متاثر ہوتا رہا مگر ان تمام مصائب اور پریشانیوں کے باوجود ہر موڑ اور ہر منزل پر اردو شعر و ادب ایک نئی توانائی کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ اور ہر انقلاب اس کی ترویج و اشاعت کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

غدر کے زمانے میں دہلی کے تباہ حال شعراء اور ادباء فکر معاش اور تلاش سکون میں ان دیسی ریاستوں میں پہنچنے لگے۔ جہاں انھیں اطمینان کے آثار نظر آئے چنانچہ رامپور، بھوپال اور حیدر آباد دکن کے درباروں میں شعرائے دہلی کے نغمے سنائی دینے لگے۔

اسی دورِ افتراق میں ذوق، غالب، اور مومن کے بہت سے تلامذہ نے راجستھان کا بھی رخ کیا جو اس زمانے میں راجپوتانہ کے نام سے موسوم تھا۔ اور مختلف چھوٹی بڑی خود مختار ریاستوں پر مشتمل تھا۔ ان ریاستوں میں الور، جے پور، جودھپور، کوٹہ، جھالاواڑ، اور ٹونک خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ وہاں کے حکمرانوں نے غدر کے پریشان حال ارباب علم و فن کو اپنی ریاستوں سے وابستہ کر کے ذہنی سکون و اطمینان فراہم کیا۔ اور اہل علم و فن کی دلجوئی کر کے ادب نوازی اور علم پروری کا ثبوت دیا۔

ان حضرات کو جب ذہنی سکون اور معاشی اطمینان نصیب ہوا۔ تو انھوں نے شعر و ادب اور علم و فن کے وہ جوہر دکھائے کہ جا بجا شعر و سخن کے نغمات گونجنے لگے اور حکمرانوں کے دربار، علم و ادب کے گہوارے نظر آنے لگے۔ اسی ادبی ماحول کا اثر تھا کہ بیشتر ریاستوں میں اردو کو سرکاری دفاتر کی زبان کا درجہ حاصل ہوا۔

ایسے ہی ماحول سے متاثر ہو کر وہاں کے ایک شاعر منشی کرشن گوپال مخمور نے کہا تھا:—

شور ہے شعر و سخن کا ہر طرف ان دنوں الور جہاں آباد ہے

یہی ادبی ماحول ریاست جے پور میں قائم ہوگیا تھا۔ اور اسی بنا پر بابائے اردو مولوی عبدالحق نے
جے پور کو چھوٹی دلی کے نام سے منسوب فرمایا تھا۔

راجستھان کی واحد مسلم ریاست "ٹونک" بھی اپنی علم پروری اور ادب نوازی میں کسی سے پیچھے
نہیں رہی۔ بلکہ وہاں کے حکمرانوں کے علوم شرقیہ سے لگاؤ اور شعر و سخن سے دلچسپی کے باعث ادبی اعتبار
سے ٹونک کو نمایاں حیثیت حاصل تھی اور ملک کی دوسری ریاستوں کی طرح ٹونک کو بھی اردو شعر و ادب
کا ایک مرکز سمجھا جانے لگا تھا۔

قیام ریاست ہی کے زمانے سے یہاں ہندو مسلم اتحاد و یگانگت کا لحاظ رکھا گیا۔ بڑی بڑی ذمہ داریاں
لیاقت کے مطابق غیر مسلم حضرات کے سپرد کی گئیں اور ان کو شریک کار کیا گیا۔ نواب امیر الدولہ بہادر
کے شرکائے کار میں منشی بساون لال شاداں مصنف (امیر نامہ فارسی) کا نام بھی اہمیت رکھتا ہے جو
امیر الدولہ کی مہمات میں بھی ان کے ہم رکاب رہے۔ اور قیام ریاست کے بعد نائب میر منشی اور پھر میر منشی
کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے۔

ریاست ٹونک کی اولین تاریخ "امیر نامہ" ان کا وہ تاریخی شاہکار ہے جس میں امیر خاں بہادر
کی پوری تصویر دیکھی جا سکتی ہے اس میں مصنف نے چشم دید واقعات درج کر کے اس کو اتنا اہم
بنا دیا ہے کہ میجر پرنسپ نے اس کا فارسی سے انگریزی ترجمہ کر کے اسے ولایت میں شائع کرایا۔

اسی زمانہ میں ٹونک میں حضرت جوش ملیح آبادی کے جد امجد حضرت فقیر محمد گویا کی موجودگی اس
حقیقت کو ثابت کرتی ہے کہ یہاں قیام ریاست ہی کے زمانے سے اردو شعر و سخن کا سلسلہ شروع ہو گیا
تھا۔ اور اس میں غیر مسلم حضرات کا بھی دخل تھا۔ چنانچہ بساون لال شاداں صرف فارسی ہی کے ادیب
اور شاعر نہیں تھے۔ بلکہ گاہے گاہے اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔

امیر الدولہ کے بعد ان کے جانشین نواب وزیر الدولہ بہادر کا عہد حکومت (۱۸۳۴ء تا ۱۸۶۴ء)
ادبی نقطۂ نظر سے بڑی تاریخی اہمیت کا حامل رہا۔

نواب وزیر الدولہ بہادر کے جانشین نواب محمد علی خاں بہادر کے عہد حکومت (۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۷ء)
میں اردو کو ریاست کی سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوا۔ ان کے جانشین نواب ابراہیم علی خاں بہادر
کا عہد حکومت (۱۸۶۷ء تا ۱۹۳۰ء) ٹونک کی ادبی تاریخ کا سنہری دور تصور کیا جاتا ہے اس دور

ہیں شعر و سخن کے ساتھ ساتھ نثری ادب کی جانب بھی توجہ کی گئی۔

ٹونک میں اس دور کے غیر مسلم شعراء و ادباء میں منشی نتھن لال بھجن، منشی دیبی پرشاد بشاش، منشی رام کشن جوشی، منشی نانک رام بھار گو، منشی گوردیال سنگھ کائستھ، منشی بالا سہائے مستعدی اور منشی جمنا سہائے متعدی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اسی دور ابراہیمی میں پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی ٹونک میں پیدا ہوئے۔ جو دنیائے ادب کے مستند مؤرخ، محقق، ادیب، انشاء پرداز، اور ماہر لسانیات تسلیم کئے جاتے ہیں۔ جن کے تخلیقی شاہکار تاریخ ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پروفیسر محمود شیرانی کے صاحبزادے اختر شیرانی نے دنیائے شعر و سخن میں اپنے والد بزرگوار ہی کی نہیں بلکہ اپنے وطن کی عظمت کو چار چاند لگائے اور آسمان سخن پر اختر درخشاں بن کر ضوفگن ہوئے۔ اور اردو شاعری کو رومانی تحریک سے روشناس کرایا۔

اختر کی شاعرانہ عظمت کا دور نواب ابراہیم علی خاں خلیل کے جانشین نواب محمد سعادت علی خاں سعید کے عہد حکومت (۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۷ء) کا زمانہ تھا۔ ان کے معاصرین میں حافظ محمد عمر خاں جام، حضرت سید محمود الحسن صولت اور حضرت بسمل سعیدی کو اساتذۂ سخن کا فخر حاصل ہوا۔

دوسرے اہم شعراء کے علاوہ منشی جگن ناتھ پرشاد شاد، ڈاکٹر منوہر سہائے انور اور ماسٹر رام نواس ندیم کے نام خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہیں۔ جو ہمارے اس دعوٰی کی دلیل پیش کرتے ہیں کہ اردو زبان و ادب پر کسی مخصوص فرقے یا طبقے کی اجارہ داری نہیں ہے۔

اردو زبان و ادب کے چمن کی آبیاری بلا تفریق مذہب و ملت ہر دور اور ہر خطے میں ہوتی رہی ہے ہندو مسلم اور سکھ و عیسائی شعراء کی اگر فہرست مرتب کی جائے۔ تو اس کے لئے دفتر درکار ہے۔ شعر و ادب کے ہر شعبے میں ہزار ہا نام نظر آتے ہیں خصوصاً بیسویں صدی میں تو ان حضرات کی فہرست مرتب کرنا ایک تحقیقی کام کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس دور میں ملک میں سیاسی سماجی اور اصلاحی تحریکات کے ساتھ ادب کے میدان میں ترقی پسند تحریک منظر عام پر آئی جس کی پہلی کانفرنس کی صدارت منشی پریم چند نے فرمائی تھی۔ منشی صاحب کا نام جدید اردو ناول اور افسانے کی تاریخ میں سر فہرست نظر آتا ہے ان ہی کے نقش قدم پر کرشن چندر، راجندر سنگھ

بیدی، رویندر ناتھ اشک، کنھیا لال کپور، تیرتھ رام فیروزپوری اور جمنا داس اختر نے چل کر ہمارے افسانوی ادب کو کمال پر پہنچایا۔

اردو تاریخ میں لالہ سری رام اور رام بابو سکسینہ کا کارنامہ ناقابلِ فراموش ہے۔ تنقید و تحقیق کے باب میں کیفی دتاتریہ، مالک رام، پروفیسر گیان چند، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ شعر و سخن کی دنیا میں آنند نرائن مُلا، ترلوک چند محروم، منور لکھنوی اور رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری وغیرہ کے ناموں سے کون واقف نہیں ان میں سے بہت سے حضرات ابھی بقید حیات ہیں جو اردو شعر و ادب کی ترقی کے ضامن کہے جا سکتے ہیں۔

دوسرے مقامات کی طرح ٹونک میں بھی ہر رئیس کے زمانے میں اردو زبان و ادب کی خدمت، مذہب و ملت کی تفریق سے بالاتر رہ کر ہر فرقے اور طبقے کے لوگ انجام دیتے رہے ہیں چنانچہ دورِ سعیدی کے غیر مسلم حضرات میں ماسٹر رام نواس جی ندیم کا نام نمایاں طور پر سامنے آتا ہے جنھوں نے ۱۹۰۶ء میں ٹونک میں جنم لیا تھا۔ اور اسی سال ٹونک میں اختر شیرانی بھی پیدا ہوئے تھے۔ یہ دور ٹونک کے ادبی ماحول کے شباب کا زمانہ تھا جس نے ندیم کے فطری ذوقِ شعر و ادب کو پروان چڑھایا تھا۔

ندیم کے والد منشی مرلی دھر جی عہدِ ابراہیمی میں متھرا سے ٹونک آئے تھے وہ ہندی اور سنسکرت کے علاوہ فارسی اور اردو زبان پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ یہاں آکر وہ ریاست کی سرکار سے وابستہ ہو گئے اور مختلف محکموں میں بحیثیت اہل کار نہایت نیکنامی کے ساتھ آخر عمر تک خدمت انجام دیتے رہے۔

منشی مرلی دھر جی کو علم و ادب سے لگاؤ تھا۔ وہ اپنے فرائضِ منصبی سے فارغ ہو کر روزانہ اپنے گھر پر محلے کے بچوں کو پڑھایا کرتے تھے جن میں پسماندہ طبقے کے بچوں کو وہ خصوصی طور پر شامل کرتے تھے۔ ٹونک میں وہی پہلے شخص تھے جنھوں نے شیڈولڈ کاسٹ کے بچوں کی تعلیم کی جانب توجہ کر کے ان میں تعلیم کا شوق پیدا کیا۔ بھلا ایسے شخص کے فرزند میدانِ تعلیم میں کیسے آگے نہ بڑھتے۔؟

انھوں نے شروع ہی سے رام نواس جی کی تعلیم پر توجہ کی اور ہندی و سنسکرت کے ساتھ ساتھ اردو و فارسی کی تعلیم کا بھی سلسلہ جاری کیا۔ انھیں خود بھی پڑھایا۔ اور اس زمانے کے بہترین معلم، فارسی اور اردو کے متبحر عالم مولانا محمد یوسف خاں صاحب کی خدمت میں تحصیل علم کے لئے بھیجا۔

مکتب کی تعلیم سے فارغ ہو کر رام نواس جی نے اردو و فارسی مضامین کے ساتھ ہائی اسکول کا امتحان

پاس کیا۔ جو اس زمانے میں ٹونک میں عوام کے لئے معراج تعلیم کی حیثیت رکھتا تھا۔
ہائی اسکول پاس کرتے ہی دربار ہائی اسکول ٹونک میں بحیثیت مدرس آپ کا تقرر ہو گیا۔ گویا اپنے والد کی تعلیمی دلچسپی کو میراث بنایا۔ اور ان کے نقش قدم پر اس طرح گامزن ہوئے کہ درس و تدریس کا مشغلہ ہی جزو زندگی بن کر رہ گیا۔

چونکہ رام نواس جی کو علم و ادب کا فطری شوق تھا اس لئے انھوں نے ہائی اسکول کی تعلیم کو ہی اپنی معراج نہ سمجھا۔ بلکہ بحیثیت مدرس بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ پہلے ایف۔ اے اور پھر بی اے کے امتحانات اردو و فارسی ادبیات کے ساتھ پاس کئے۔ ٹونک کے غیر مسلم حضرات میں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ موصوف نے دوران گفتگو یہ بتایا تھا۔ کہ جب انھوں نے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا تھا۔ نواب صاحب بہادر نے ان کو خلعت و اکرام سے نوازا تھا۔ اور اس خوشی میں ہاتھی پر بٹھا کر ایک جلوس کے ساتھ شہر کا گشت کرایا تھا اس اعزاز و اکرام نے رام نواس جی کی ہمت افزائی کی اور انھوں نے فارسی میں بھی ایم اے کا امتحان پاس کیا۔

دوران ملازمت آپ نے محکمہ تعمیرات میں بھی ایکاؤنٹینٹ کی حیثیت سے کچھ دنوں کام کیا۔ مگر چونکہ علم و ادب اور درس و تدریس سے فطری لگاؤ تھا۔ اس لئے اسکول کی مدرسی کے علاوہ کسی دوسرے محکمہ کی افسری کو بھی پسند نہ کیا۔ چنانچہ محکمۂ تعمیرات سے واپس محکمۂ تعلیمات میں آئے اور مدرسی سے ترقی پا کر ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ اور ٹونک شہر کے علاوہ ریاست کے پرگنات سرونج اور چھبڑہ وغیرہ کے اسکولوں میں ہیڈ ماسٹری کے عہدوں پر فائز رہے

قیام راجستھان کے بعد جب ٹونک کی ریاستی حیثیت ختم ہو چکی تھی اور یہاں صوبۂ راجستھان کا ایک ضلع قائم ہو چکا تھا۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں مقامی ہائی اسکول کو ترقی دے کر انٹر کالج بنایا گیا۔ اور اس میں ماسٹر رام نواس جی ندیم کو اردو و فارسی کا لکچرر مقرر کیا گیا۔ چونکہ اس وقت تک وہ اردو میں ایم اے نہیں تھے۔ اور کالج میں لکچرر کی جگہ شعبۂ اردو میں تھی اور اس جگہ کے لئے پبلک سروس کمیشن سے باقاعدہ ان کا سلکشن نہیں ہو سکا تھا۔ اس لئے اردو کے لکچرر کی حیثیت سے ان کا کالج میں رہنا ممکن نہ تھا۔ اور ان کی خواہش ہی یہ تھی۔ کہ وہ اردو کے لکچرر رہ کر درس و تدریس کی خدمات

انجام دیں۔

اس خواہش کی تکمیل کے لئے انھوں نے اس عمر میں اردو ادبیات میں بھی ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ مگر تقدیر نے ان کا ساتھ نہ دیا۔ ان کے لئے انٹر کالج میں بھی فارسی کے لکچرر کی الگ پوسٹ قائم کی گئی۔ مگر حالات ساز گار نہ رہے اور طلبہ کی کمی کے باعث ان کی لکچرر شپ کا خواب تشنۂ تعبیر ہی رہا اور ان کو انیارہ ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹری پر فائز کر دیا گیا۔ اس کے بعد آپ کو ترقی دے کر محکمہ آرکائیز راجستھان کا اسسٹنٹ ڈائرکٹر بنا دیا گیا جس کا صدر دفتر بیکانیر میں تھا۔ یہاں آپ نے اپنے فرائض منصبی نیک نامی کے ساتھ انجام دے کر ۱۹۶۰ء میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے عہدے سے پنشن حاصل کی اور بقیہ عمر مذہبی، علمی اور ادبی مشاغل میں بسر کی۔

اسی زمانے میں ماسٹر رام نواس جی ندیم، انجمن ترقی اردو ٹونک کے نائب صدر بھی رہے۔ وہ چاہتے تو پنشن کے بعد بھی انھیں ملازمت مل سکتی تھی مگر انھوں نے ملازمت کا طوق دوبارہ اپنے گلے میں ڈالنا پسند نہیں کیا۔ ہاں اگر انھیں اردو یا فارسی کا لکچرر بنا دیا جاتا تو ہرگز گریز نہ کرتے۔

جولائی ۱۹۶۰ء میں راقم الحروف کا تبادلہ گورنمنٹ کالج اجمیر سے گورنمنٹ کالج ٹونک میں ہوا۔ خوش قسمتی سے رہائشی مکان ماسٹر رام نواس جی ندیم کے دولت کدے کے قریب ہی ملا۔ اسی زمانے میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے اور ٹونک آچکے تھے اس لئے روزانہ ہی ان سے ملاقات رہتی تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنی زندگی کے حالات پر بھی روشنی ڈالتے تھے۔ ٹونک کے قدیم ادبی ماحول کے دلدادہ تھے جس نے ان کو اردو و فارسی میں ایم اے تک کی تعلیم کا شوقین بنایا تھا۔ ورنہ وہ شاید کسی اور موضوع میں ایم اے کرتے یا نہ کرتے

انھیں آخر تک یہ قلق ضرور رہا۔ کہ وہ لکچرر نہ رہ سکے اور اس کے لئے وہ کہا کرتے تھے کہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی پوسٹ کے بجائے، اردو کا پروفیسر رہ کر میں زیادہ خوشی اور فخر محسوس کرتا تقریباً ساڑھے چار سال پنشن لینے کے بعد جنوری ۱۹۶۵ء میں، آپ نے داعئ اجل کو لبیک کہا۔

حضرت ندیم کی تمام عمر درس و تدریس میں گزری۔ شعر و ادب سے فطری ذوق تھا۔ والد کی تربیت نے اسے جلا دی اور ماحول کے اثرات نے پروان چڑھایا۔ حضرت کیف کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ان کے بعد حضرت صولت مرحوم کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوئے۔ ان اساتذہ کی اصلاح نے کلام کے

حسن کو سنوارا اور نکھارا۔
حضرت ندیم نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی اس پر کلاسیکی شاعری کا گہرا اثر تھا۔ وہی حضرت ندیم نے بھی قبول کیا چنانچہ ان کی غزلیات میں کلاسیکی رنگ سخن ہی نظر آتا ہے۔ مگر آپ نے بناوٹ اور تصنع کی جگہ سادگی اور سچائی سے کام لیا ہے مشکل تشبیہات و استعارات سے پرہیز کرتے ہوئے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

کر کے اس بت سے محبت مجھے معلوم نہ تھا　　ہو گی دنیا سے عداوت مجھے معلوم نہ تھا

جب کبھی اس بے وفا کو یاد کر لیتا ہوں میں
راحت و صبر و سکوں برباد کر لیتا ہوں میں

کثرت غم میں بھی لب پر مرے فریاد نہیں　　خوگر جور ہوں میں شاکی بیداد نہیں

سکوں ہوگا حاصل دل مضطرب کو
تصور میں ان سے اگر بات کر لی

سر بسر تصویر مایوسی نظر آتی تمھیں　　تم اگر آ کر مرا حال پریشاں دیکھتے

ضبط اک دن فغاں نہ ہو جائے　　وہ کہیں بدگماں نہ ہو جائے
زندگی میری عشق کے ہاتھوں　　درد کی داستاں نہ ہو جائے
جس کو دل میں چھپا کے رکھا ہے　　وہ نظر سے عیاں نہ ہو جائے

لیکن اس کا یہ مقصد نہیں کہ ندیم نے صرف واردات عشق ہی کو موضوع سخن بنایا۔ بلکہ مضامین کے اعتبار سے ان کے کلام میں تنوع نظر آتا ہے اسی طرح صرف کلاسیکی غزل کو ہی انھوں نے اپنے خیالات کی ترجمانی کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔

انھوں نے ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی جہاں درباداری اور ریاستی شان و شوکت باقی تھی اور اسی کی وجہ سے قصیدہ گوئی اور تہنیتی نظم نگاری کا رواج باقی تھا۔ ندیم نے اس کا بھی لحاظ رکھا اور تہنیتی نظم بھی لکھی۔ اور قصیدہ بھی کہا۔ اسی طرح مسلم ریاست ہونے کے باعث نعت گوئی کو ٹونک میں بڑی مقبولیت حاصل رہی ندیم نے اس کی بھی پاسداری کی اور بارہا نہایت عقیدت و احترام کے

ساتھ بارگاہِ نبوی میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا - ان کے نعتیہ کلام کو دیکھ کر یہ اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ یہ اشعار کسی غیر مسلم کے بھی ہو سکتے ہیں :- مثلاً -

سردارِ کائنات ، حبیب خدا ہیں آپ
سرتاجِ ممکنات سرانبیاء ہیں آپ

غزل ، قصیدہ ، نعت اور منقبت کے علاوہ ندیم نے قطعات و رباعیات پر بھی طبع آزمائی کی ہے - آزادئ وطن کے بعد قومی و ملکی نظمیں بھی کہی ہیں - ان کے کلام کا یہ مجموعہ ان کے صاحبزادے مسٹر ہنومان سنگھل مرتب کر رہے ہیں جو بعد اشاعت ٹونک کی ادبی خدمات میں ایک اضافہ ہوگا اسی وقت ان کی شاعرانہ عظمت اور قدر و قیمت کا جائزہ بھی صحیح طور پر لیا جا سکے گا -

شعر و سخن سے قطع نظر حضرت ندیم نے نثر نگاری کی جانب بھی توجہ کی اور مختلف موضوعات پر چند مضامین کے علاوہ قلعہ رنتھمبور کی تاریخ پر قلم اٹھایا اسی موقعہ پر اس قلعہ کی تاریخ سے متعلق آپ کو ایک قدیم فارسی مخطوطہ کے مطالعہ کا موقع ملا تھا جس کا آپ نے اردو ترجمہ کیا - اور پھر دیگر تاریخی کتب سے استفادہ کرکے اردو میں رنتھمبور کی تاریخ مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا - ان کے ریٹائرڈمنٹ کے بعد ان کے علمی و ادبی مشاغل میں یہ کام بھی شامل تھا - اسی دور میں پیغام اجل آجانے کے باعث یہ تاریخ مکمل نہ ہو سکی - ان کے صاحبزادے مسٹر ہنومان سنگھل اس سلسلے میں کوشاں ہیں - کہ ان کے مسودات اور اوراق منتشر کو یکجا کرکے ندیم کے اس نثری کارنامہ کو منظر عام پر لائیں -

ان کے صاحبزادے مسٹر سنگھل نے ندیم کی علمی و ادبی خدمات کو ٹونک میں اس طرح جاری رکھا ہے کہ انھیں کی نسبت سے ایک ماہانہ رسالہ "ندیم" جاری کیا ہے اگرچہ یہ مختصر رسالہ ملک کے مقتدر جرائد میں رونمائی کی حیثیت نہیں رکھتا - تاہم ٹونک کی ادبی تاریخ کی تحقیق کیلئے کچھ مواد فراہم کر رہا ہے -

اس رسالے کے خصوصی شماروں "ندیم نمبر" اور "پروفیسر محمود شیرانی نمبر" کے علاوہ انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند کی آٹھویں سالانہ کانفرنس کی روداد کی اشاعت سے رسالے کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے یہ رسالہ یقیناً ٹونک کے ادبی ماحول کی آئینہ داری کرے گا -

مولانا سید عبدالقادر خنداں ۔ سابق ایڈیٹر مشعل ۔ و ۔ جھلک

ماسٹر رام نواس ندیم

ایک مخلص دوست

گردش روزگار کا مارا اور ستایا ہوا جب میں دار الخیر اجمیر سے دار الاسلام محمد آباد ٹونک آیا تو مجھے یہاں کے علمی اور ادبی ماحول نے بڑا سکھ اور سکون دیا ۔ اطمینان وسکون کا سانس لینے کے بعد جب مجھے یہاں کے شعراء و ادباء حضرات سے متعارف ہونے کا موقعہ ملا ۔ تو یوں محسوس ہوا ۔ کہ میں اپنے ہی وطن میں ہوں اور اپنے ہی گھر میں ۔ اور یہاں کے ادیب اور شاعر اخوت و محبت کے چلتے پھرتے نمونے ہیں ۔ ان سب سے مل کر میں ان میں اس طرح شیر وشکر ہوا ۔ کہ زمانے کی تلخیوں اور اجمیر کے ناخوشگوار حادثات کا اثر کچھ ہی عرصے میں میرے دل و دماغ سے کم ہو گیا ۔ میں نے یہاں اپنی علمی و ادبی سرگرمیاں شروع کر دیں ادباء اور شعراء کے حلقوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا ۔ اپنی اس پذیرائی کے باعث میں نے غریب الوطن ہونے کے باوجود رنج غربت و مسافرت کو ٹونک کے احباب کی معیت و رفاقت میں بھلا سا دیا ۔

ان ہی بہت سے احباب میں مجھے ایک ایسی محب شخصیت ملی جو اپنے اخلاص و محبت کے باعث مجھے اپنی طرف کھینچنے لگی ۔ میں بھی اس کی طرف بڑھا ۔ مذاق علمی اور شعر و شاعری کا ذوق باہم گہرے روابط کا روپ دھارنے لگا ۔ غالب کو تو 'ندیم دوست' سے بوئے دوست آتی تھی لیکن میرا معاملہ تو یہ تھا ۔ کہ میرا تو دوست ہی خود ندیم تھا ۔ اس لئے مجھے جو قربت و لطف ندیم' اپنے دوست کی رفاقت میں ملا اس کا اظہار کرنا زبان قلم سے ممکن نہیں ۔

ماسٹر رام نواس جی ندیم سے میری یہ ملاقات اور رفاقت اس وقت سے شروع ہوئی جب میں یہاں نووارد تھا ۔ اور بالکل نووارد ۔ میں نے اس کا تجربہ کیا ۔ کہ وہ بہت مخلص اور خلوص کے انسان تھے ۔ میل ملاپ ، اتحاد ، دوستی ، اور ملنساری کا وہ ایک جیتا جاگتا نمونہ تھے ۔ مروت اور شرافت کے جوہر ان میں فطری تھے ۔ بہت ہی متواضع اور منکسر المزاج تھے ۔ وہ ایک اچھے اور مہربان استاد کی حیثیت

سے ٹونک کے علمی حلقوں میں اچھی شہرت کے مالک تھے۔ اسکول ٹیچر تھے اس لئے سینکڑوں نونہالانِ وطن نے ان کے دامنِ تربیت سے فیض پایا تھا۔

اردو و فارسی زبانوں کے وہ کامیاب معلم تھے۔ درس و تدریس ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ اور اسی کے ذریعے وہ خدمتِ خلق کیا کرتے تھے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ علم و ادب کی تعلیم و تدریس میں بسر ہوا۔ سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں ان کی علمیت و قابلیت کا سکہ رواں تھا۔ اچھے اچھے قابل لوگوں کو میں نے ان کی عزت و تکریم کرتے دیکھا ہے۔

وہ ہر ادبی مجلس اور محفل کے شمع محفل بن کر رہے ہے ان کی علمی صلاحیتوں نے انھیں طلباء کا مرجع و مآب بنا دیا تھا۔ سرکاری ڈیوٹی سے فرصت پانے کے بعد وہ ٹیوشن بھی پڑھایا کرتے تھے ان کی شخصیت اعتماد اور بھروسے کا سنگم تھی بڑے سے بڑے شریف خاندان کے بچے اور بچیاں ان کی ٹیوشن کے لئے خواہش اور آرزو کیا کرتے تھے۔

وہ ایک شریف ہندو تھے اس لئے انھوں نے ہندو مسلم بھید بھاؤ کے نظریات سے ہمیشہ بیزاری و نفرت کا اظہار کیا۔ وہ سب ہی سے محبت و اخلاص سے ملتے اور ہندو مسلم سب ہی کی خدمت کے لئے بلا کسی تفریق کے ہمہ اوقات آمادہ و تیار رہتے

وہ جس طرح علوم مغربی کے شناور تھے اسی طرح علوم مشرقی کے بھی دل دادہ اور رمز شناس تھے فارسی و اردو ادب کے وہ بڑے ماہر تھے، علم عروض پر انھیں دسترس تھی، تاریخ پر ان کی اچھی نظر تھی، قدیم اساتذہ، علماء، ادباء اور شعراء کے وہ صحبت یافتہ تھے۔ اس لئے ان میں قدیم تہذیب اور قدیم روایات کی پاس داری کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ قدیم تہذیب اور مشرقی روایات کا وہ ایک نادر، اچھوتا اور فقید المثال نمونہ تھے۔

ادب و شعر کے معاملے میں بھی ان کا ذوق بہت بلند تھا۔ وہ ایک اچھے شاعر اور ایک اچھے نظم گو بھی تھے چونکہ ایک اچھے استاد کے اوصاف ان میں جلوہ گر تھے اس لئے شاعری میں بھی استادانہ شعور کو کام میں لائے بغیر نہ رہتے تھے۔ بہت صاف ستھرے شعر کہتے تھے۔ اکثر طرحی مشاعروں میں مجھے ان کے ساتھ شریک ہونے کا موقعہ ملا ہے۔ ان کی طرحی غزلیں سنی ہیں ان کے دیگر اصناف سخن کے کچھ نمونے بھی، گاہ بگاہ نظر سے گزرے ہیں اور مختلف علمی، ادبی اور شعری مجلسوں اور صحبتوں میں ساتھ رہنے کی وجہ سے

ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ اس بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک طبع دوست شاعر تھے۔

ان کے متعلق میرے جذبات خلوص و محبت کا یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے۔ جو میں اپنے عزیز شری ہنومان سنگھل کو "ندیم نمبر" کے لئے قلمبند کر کے دے رہا ہوں۔ گویا در حقیقت آنجہانی ماسٹر رام نواس "ندیم" کی ذاتِ گرامی کو خراجِ عقیدت پیش کر رہا ہوں۔

میرے دادا حضور

راجیو سنگھل

میں اس وقت بہت ہی کم عمر بچہ تھا۔ جب ہمارے دادا حضور کا مسکراتا چہرہ، بے پناہ شفقت اور محبت ہمیں میسر تھی۔ ایک کہرام سا مچ گیا تھا۔ جب وہ ہم سب کی محبت کو چھوڑ کر اور ہم سب سے ناطہ توڑ کر ملک عدم کے لمبے سفر پر روانہ ہوئے تھے ہم تھے تو چھوٹے ہی۔ مگر دل و دماغ پر ان کی وفات کا ایک گہرا اثر ہوا تھا۔

اس وقت ہم یہی سوچتے تھے۔ کہ ایک پیار کی مورت نہیں رہی گھر کا ایک شفیق کم ہو گیا۔ ہمارے دادا حضور ہمارے بیچ نہیں رہے مگر رفتہ رفتہ جیسے جیسے ہم ہوشیار ہوتے گئے تو ہمیں پتہ چلا۔ کہ بہت کچھ نہیں رہا۔ ایک باپ ایک دادا، ایک پیار کی مورت، نہیں رہی۔ ایک معلم نہیں رہا ایک انسانیت کا پرستار چلا گیا۔ ایک استاد اور ایک شاعر نہیں رہا۔ اور اب ہمیں معلوم ہوا کہ ہم نے تو کم ہی کھویا مگر اس شہر ٹونک نے ان کی وفات سے بہت کچھ کھو دیا۔

وہ کیا تھے اس کا علم ہمیں اب ہو رہا ہے۔ ان کے جذبۂ انسانیت اور خدمتِ خلق سے لبریز کارنامے ان کی نثری اور شعری تخلیقات آج جب ہمارے سامنے آئیں تو دل مسرت سے باغ باغ ہونے لگا اور فخر سے ہمارا سر اونچا ہو گیا۔

بقیہ صفحہ ۳۱ پر

ماسٹر محمد صادق بہار ٹونکی

ماسٹر رام نواس ندیم
ایک عہد آفریں شخصیت

ہنسی سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

سرزمین ٹونک نے جہاں علم و ادب کی ترویج و تخلیق کے سلسلے میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہاں اس کا شاندار ماضی بھی اپنی ہندو مسلم گنگا جمنی تہذیب، امن دوستی اور غیر مسلموں کے ساتھ نمایاں حسن سلوک میں انفرادیت رکھتا ہے۔

بانئ ریاست اور مرد مجاہد، نواب امیر خاں صرف ایک مرد شجاع ہی نہیں تھے بلکہ انتہائی انسان دوست اور جوہر شناس رئیس بھی تھے ان کے حلقۂ احباب میں راجہ مان سنگھ والئی جودھ پور، مہا رانا بھیم سنگھ رئیس اودے پور صرف شامل ہی نہیں تھے۔ بلکہ انھیں "پگڑی بدل" بھائی ہونے کا بھی شرف حاصل تھا اسی طرح راجہ صاحب سنگھ والئی پٹیالہ اور مہاراجہ رنجیت سنگھ "شیر پنجاب" بھی ان کے قابل اعتماد رفیق کار تھے۔

ان سب کے علاوہ مہاراجہ ظالم سنگھ جھالا والئی کوٹہ اور راؤ ہلکر والئی اندور ہمیشہ معاملات اور غیر معمولی حالات میں ان کے دست راست بنے رہے۔

جب ۱۸۱۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے باقاعدہ تعاہد کی تکمیل ہو جانے پر ریاست کی تشکیل عمل میں آئی تو ریاست کے عہدے داروں میں مسلم عمائدین کے دوش بدوش ہندو علماء بھی بام عروج پر جا پہنچے اور یہ سلسلۂ لامتناہی اختتام ریاست ۱۹۴۸ء تک قائم رہا۔ بقول مولانا منظور الحسن برکاتی،

"ٹونک کے سب سے پہلے میر منشی دربار، مؤرخ ریاست، امیر نامہ کے مصنف ایک شریف ہندو خاندان کے ممتاز فرد، بسادن لال ستاداں تھے اور قیام ریاست کے سلسلے میں بانیٔ ریاست نواب امیر خاں کی طرف سے معاہدہ پر دستخط کرانے والے بھی ایک ہندو سفیر لالہ نرنجن لال ہی تھے۔

ان کے علاوہ ریاست کی تاریخ میں ایسے بیسیوں اہل ادب ہندو اور صاحب تصنیف حضرات کے نام سرفہرست آتے ہیں جنھوں نے ایک طرف اپنی انتظامی اعلیٰ قابلیت کی بدولت اعلیٰ خدمات اور دوسری طرف اپنی علمی ادبی اور شعری ذوق کی بنا پر بیسیوں تحقیقی، تصنیفی اور ادبی و شعری کارنامے انجام دیے ہیں)۔

ایسے باکمال حضرات میں نتھن لال بہجت، کنھیا لال آذر، دیبی پرشاد بشاش، منشی لکشمی سہائے سوز، لالہ امراؤ لال طپش، جگن ناتھ پرشاد شاد اور لالہ منوہر سہائے انور ہیں" مذکورہ ہندو صاحبان باکمال کیلئے، مسدس "آئینۂ ٹونک" کا بھی ایک بند ملاحظہ ہو۔

رائے داتا، راجہ موہن اور بسادن لال جی دراصل تھے نوِن بازوِ امیر الدولہ کے
کب سفارت پھر نرنجن لال جیسی ہو سکی عقل یونانی بھی جس کی فہم پر ششدر رہی
ان میں ہر اک شخصیت تھی بے شبہ تاریخ ساز
ٹونک کو آج تک ان ناموروں پہ ناز

۱۸۵۷ء میں پہلی جنگ آزادی کی شکست کے بعد جب دلی کا سہاگ بگڑا اور لکھنؤ کا سہاگ اجڑا تو وہاں کے یکتائے روزگار اور صاحب علم و فن حضرات نے طلب معاش کے لئے مختلف ریاستوں کا رخ اختیار کیا۔ اسی میں ایک آماجگاہ اہل ہنر ریاست ٹونک بھی تھی۔

یہ وہ وقت تھا جب کہ مسند ریاست پر نواب محمد وزیر خاں (۱۸۳۴ء تا ۱۸۶۴ء) جلوہ افروز تھے۔ آپ ایک علم دوست اور ادب نواز رئیس تھے۔ مزید برآں یہ کہ آپ کی پرورش لال قلعہ میں ہوئی تھی اور شہنشاہ اکبر ثانی، رشتہ میں آپ کے خالو بھی تھے۔ اس لئے آپ گرد و پیش کے تمام حالات سے باخبر تھے۔ ذاتی طور پر ان سے ہمدردی بھی رکھتے تھے اور اس دور کے ذی علم حضرات سے مراسم بھی رہ چکے تھے۔ چنانچہ آپ نے ہر تارک الوطن اہل علم کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور چند دنوں ہی

میں ٹونک "مجمع اہل ہنر" اور رشک اصفہان و بغداد بن گیا جس کا اعتراف مولوی احمد علی سیماب ٹونکی نے اپنے ایک قصیدے میں کیا ہے ضیافت طبع کے لئے دو شعر پیش ہیں۔

ایں ہماں بلدۂ ٹونک است کہ زیں پیش فلک
مجمع اہل ہنر منبع احساں بودست،
ایں ہماں است کہ در عہد وزیر الدولہ،
ہمچو گلزار جناں رشک صفاہاں بودست

آج بھی ان ہی اہل علم حضرات کا فیضانِ کرم ہے کہ یہاں کی مقامی شعر و شاعری تصنیف و تالیف، تمدن و تہذیب، حتی کہ بول چال تک میں ایک ایسی شائستگی، متانت اور تبحر علمی ہے جس کی مثال کسی بھی دیار و امصار میں نہیں ملتی۔

مذکورہ خدمات میں ہندو عالموں کی خدمات بھی ٹونک کی تاریخ میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں۔ آنجہانی پنڈت رام تو اس ندیم کی ذات بھی ریاست کی انھیں تاریخ ساز شخصیتوں سے منسلک ہے۔ آپ کے والد بزرگوار لالہ مرلی دھر جی اگروال نے بھی ریاست کی انتظامی خدمات انتہائی دیانت داری اور جانفشانی سے سرانجام دی تھیں شاید ایسے بزرگوں کی لئے ہی شیخ سعدیؒ نے فرمایا ہے۔ ؎

نام نیک رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نام نیکت برقرار

ندیم صاحب ۱۹۰۶ء میں خلد آشیانی نواب ابراہیم علی خاں صاحب خلیل کے زرین دور حکومت (۱۸۶۸ء تا ۱۹۳۰ء) میں پیدا ہوئے گھر کے دھارمک ماحول میں ہندی اور سنسکرت کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مروجہ فارسی تعلیم کے لئے فارسی ادب کے جید عالم منشی محمد یوسف خانصاحب مرحوم سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ دربار ہائی اسکول ٹونک سے میٹرک پاس کر کے مدرسی کا پیشہ اختیار کیا۔

ملازمت کے دوران ہی میں آپ نے ایف۔ اے، بی۔ اے اور فارسی ادب میں سیکنڈ

ڈویژن کے ساتھ ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور کہنہ سالی کے باوجود ضرورتاً اردو میں بھی ایم اے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔

مدرسی کے دوران ٹونک کے پرگنات میں بھی وقتاً فوقتاً آپ کے تبادلے ہوتے رہے۔

کچھ دنوں تک آپ محکمہ تعمیرات میں چیف اکاؤنٹینٹ کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ نواب سعادت علی خاں صاحب سعید (۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۷ء) کے عہد حکومت میں جب سعادت اسپتال کا افتتاح ہوا تو آپ نے سر دربار اکیاون اشعار کا ایک قصیدہ پڑھا۔ جو نہایت پسند کیا گیا۔ اور از راہ ادب نوازی نواب صاحب موصوف نے کثیر انعام بھی عنایت فرمایا۔ بقول برکاتی صاحب کے آپ نے نواب سعادت علی خاں صاحب مرحوم ہی کے دربار سے "پنڈت" کا اعزازی خطاب بھی پایا تھا۔ آپ کچھ عرصے تک محکمۂ کنٹرول میں کنٹرول انسپکٹر بھی رہے۔

اس کے علاوہ آپ نے نواب فاروق علی خاں صاحب کی مدح میں ان کی مسند نشینی کے مبارک موقع پر بھی ایک قصیدہ سر دربار پیش کیا جس کا مطلع ہے ؎

ہلال عید کو حاصل ہوا شرف جو کمال
وہ تیری تخت نشینی سے ہے شہا امسال

اواخر عمر میں آخری تاجدار ٹونک نواب اسمٰعیل علی خانصاحب تاج کی مدح میں بھی آپ نے ایک مختصر سا قصیدہ لکھا ہے جس کا مطلع ہے ؎

شوکت جشن ملوکانہ مبارک باشد
عشرت و شادیٔ شاہانہ مبارک باشد

مذکورہ بیان سے حاصل کلام یہ ہے۔ کہ آپ کا دامن تعلق ہمیشہ رؤسائے ٹونک سے وابستہ رہا۔ اور والیان ٹونک بھی از راہِ ادب پروری آپ کو خلعت و انعامات سے نوازتے رہے۔

آپ کی قصیدہ نگاری سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ ایک قادر الکلام شاعر تھے کیونکہ قصیدہ ہی وہ واحد صنف سخن ہے۔ جہاں شاعر اپنی قادر الکلامی، قابلیت اور تخیل کی بلند پروازی کے بھرپور جوہر دکھاتا ہے۔

مذکورہ خصوصیات کے قطع نظر آپ کی تخلیق بہ قدرت نے حسب مقدر کام کے لئے فرمائی تھی وہ شغل مدرسی ہی تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ آپ کی شخصیت کا یہ روشن پہلو زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔ آپ کے تلامذہ کا سلسلہ ٹونک، راجستھان، یا ہندوستان تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ بیرونِ ملک تک چلا گیا ہے۔

ان شاگردوں میں سینکڑوں کی تعداد میں ادیب، شاعر، وکیل اور عالم و فاضل ہیں کئی شاگرد بڑے بڑے اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز ہیں اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ ہر شاگرد آپ کی شاگردی پر فخر محسوس کرتا ہے۔ بقول استاد محترم استاذ السلطان حضرت مولانا سید عبدالقادر صاحب خنداں نگینوی :—

"وہ اردو فارسی زبانوں کے کامیاب معلم تھے درس و تدریس کا دلچسپ مشغلہ تھا اور اسی کے ذریعہ وہ خدمت خلق کیا کرتے تھے ———"

حضرت مراد سعیدی نے بھی ان کی تدریسی خدمات کے لئے یہ عقیدت کے پھول بکھرائے ہیں[5]

علم کی دنیا میں تھے وہ آفتاب و ماہتاب
ان کے فیضِ علم سے ذرے بنے تھے آفتاب

زندگی بھر درس دینے کا رہا ہے ان کو ذوق
مرتے دم تک بھی نہ چھوٹا ان کے دامن سے یہ شوق

یہ بات بھی بغیر کسی پس و پیش کے کہی جا سکتی ہے کہ ان کی قابلیت محض اردو و فارسی تک ہی محدود نہیں تھی۔ بلکہ وہ مکمل ٹیچر تھے، ہر مضمون پر ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ ادبیات سے قطع نظر علم تاریخ اور علم ریاضی میں ان کا مطالعہ اور ملکہ قابل رشک تھا۔

جب ۱۹۵۲ء میں ٹونک میں انٹر کالج کھلا تو اس وقت ندیم صاحب کی دلی خواہش اردو کے لکچرر کی حیثیت سے تدریسی خدمت انجام دینے کی تھی۔ مگر یہ سعادت شاید آپ کے مقدر میں نہ تھی۔ اس کی روداد محترم ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی کی زبانی سنیئے۔!

"رام تواس جی نے درس و تدریس کو ذریعۂ معاش بنایا انھوں نے اپنے شوق اور ذاتی

لیاقت کی بنا پر فارسی ادب میں ایم اے کا امتحان پاس کیا اور ٹونک انٹر کالج میں اردو
و فارسی کے عارضی لیکچرر مقرر ہوئے۔ ان کی دلی تمنا تھی۔ کہ وہ اس کالج میں اردو کے پروفیسر
کی حیثیت سے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھیں۔

اس مقصد کی تکمیل کے لئے انھوں نے اپنی ملازمت کے آخری زمانے میں اردو ادب
میں ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ مگر یہ خواب تشنۂ تعبیر ہی رہا اور ان کو ایک ہیڈ ماسٹر کی
حیثیت سے تبادلہ پر تحصیل اناره جانا پڑا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد آرکائز راجستھان کے
اسسٹنٹ ڈائریکٹر بن گئے مگر ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ اس اسسٹنٹ ڈائریکٹری کے
مقابلہ میں اردو کا پروفیسر رہ کر میں زیادہ خوشی اور فخر محسوس کرتا۔ "

اس واقعہ سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہ وہ بقول ماسٹر حامد رشید صاحب ٹونکی اردو ادب
کے ایک سچے پجاری تھے۔

جہاں تک آپ کے مسلک اور شخصیت کا تعلق ہے یہ بات کسی ہچکچاہٹ کے بغیر کہی جا سکتی ہے۔ کہ آپ
صلح کل مسلک کے سالک تھے۔ آپ زندگی بھر " با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام " کے اصول پر
قائم رہے کبھی کسی کی دل شکنی نہیں کی۔ جس سے ملے جھک کر ملے۔ بات کی تو تبسم کے پھول بکھیرے۔
عقائد کے لحاظ سے حالانکہ آپ کلاسیکل ہندو تھے۔ تمام زندگی دھرم کرم کے چکروپو سے قدم
باہر نہیں نکالا۔ مگر تعصب کو بھی پاس پھٹکنے نہ دیا۔ ہر مذہب اور ہر روایت پر جان چھڑکی محبت اور خلوص
کو شیوۂ احسن سمجھا۔ قیام پاکستان کے بعد جب برادران وطن (مقامی مسلمانوں) نے ترک سکونت
کی۔ تو سنسان گلیوں کو دیکھ کر وہ تڑپ اٹھے۔

گر نہ کرتے ہمدم و ہمراز یوں ترک وطن
شہر کی آباد گلیاں ہم نہ ویراں دیکھتے

اسی طرح روزہ داروں سے کس احترام اور محبت سے مخاطب ہیں۔

لو روزہ دارو فضل و کرم کی نوید لو!
ایماں کے گل سے کھینچا ہے عطر بہار عید

خلوص ومحبت کے لئے بھی آپ کا مطمع نظر ملاحظہ ہو۔ ؎

خلوص شیوۂ احسن ہے شک نہیں اس میں
ہے بے بہا ہی دولت، دلِ بشر کے لئے

البتہ ظاہر داری اور نمائش سے آپ متنفر تھے اس لئے نہایت صاف گوئی سے اس برائی پر اپنی ناپسندیدگی کا بھی اظہار فرمایا ہے۔ ؎

جو خود کو دور کھینچے اور نمائش ہو ندیم اس میں
اگر لقماں بھی ہو تو ہم اسے جاہل سمجھتے ہیں

جب خواہش نام ونمود ہی دل سے مٹ گئی تو مزاج میں استغناء بیدار ہوا۔ اور استغناء نے دل کو بے نیازی کی آسودگی سے مالامال کیا۔ چنانچہ اپنی اس ذہنی آسودگی کا مشاہدہ کس پختہ اعتماد سے بیان فرماتے ہیں ؎

غنی انسان وہ ہے بے نیازی جس کو حاصل ہو
نہ ہو یہ وصف جس میں ہم اسے سائل سمجھتے ہیں

آپ کو ریاست کی ہر روایت سے دلی محبت تھی۔ ٹونک اپنی روایتی عید کے لئے بھی دور دور مشہور تھا۔ ؎

ہاتھیوں کے ہودے اور گھوڑوں کی زینیں زرنگار
نوبت ونقارے، باجے، پلٹنوں کی وہ قطار
پھر وہ توپوں کی سلامی وہ جلوس شہر یار
تھی عروس عید کی بارات کیسی شاندار

اس تمدن پر فدا تھا لکھنؤ سو جان سے
یاد آجاتی تھی دلی اس کی طرز شان سے

اور جب یہی روایت عید کی ...

بقیہ نذرہ سکا

خاں صاحب تحلیل تھی اور جس میں خاص اہتمام کے ساتھ عین عید کے دن نواب صاحب تاج کی صدارت میں ایک بزم مشاعرہ آراستہ ہوا تھا اور ندیم صاحب نے اپنی طرحی غزل میں یہ شعر پڑھا۔ ؎

ہے عید پھر بھی عید و مبارک ہو دوستو!

اگلا سا گو نہیں ہے وہ عز و وقار عید

تو حاضرین مشاعرہ پر ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی۔ اور ان کو اپنی روایت پرستی کی پوری پوری داد مل گئی۔

ندیم صاحب کی گھریلو زندگی بڑی باغ و بہار تھی۔ وہ اپنی اولاد سے انتہائی شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ شاید سنہ ۱۹۵۱ء میں ان کے بڑے صاحبزادے بہادر پرشاد کے ساتھ ایک حادثہ پیش آگیا تھا۔ اور ایک کشتی کے الٹ جانے کی وجہ سے اس جوان سال ذہین طالب علم کی اچانک موت واقع ہوگئی۔ یہی وہ داغ تھا جو ندیم صاحب کے دل کو ہمیشہ داغتا رہا۔

آپ کے چھوٹے صاحبزادے ہنومان سنگھل کو آپ نے ناز و نعم کے جھولوں میں جھلایا اور زیورِ علم سے آراستہ و پیراستہ کیا۔ مگر آپ کا رجحان طبع ہمیشہ تجارت و سیاست کی جانب راغب رہا۔ اسی لئے آج بھی ارباب سیاست میں آپ کو ایک مقتدر مقام حاصل ہے۔

ویسے آپ ہندی زبان کے ایک ابھرتے ہوئے ادیب بھی ہیں اور ادب نواز بھی۔ ادب نوازی کا ثبوت یہ ہے۔ کہ آپ نے ندیم صاحب کی یاد میں ایک عرصہ تک پندرہ روزہ اخبار 'ندیم' نکالا اور پھر اسے ماہانہ جریدے کی شکل دے کر کافی عرصہ تک نکالتے رہے۔ اور اب ندیم صاحب کا کلام ندیم نمبر کے نام سے شائع فرما کر اردو ادب میں اضافہ فرما رہے ہیں جس کے لئے ہم مشکور ہیں۔ یہ سب ندیم صاحب کی دعاؤں کا ثمرہ ہے کہ آپ کی اولادیں عیش و عشرت کے جھولوں میں جھول رہی ہیں۔

آپ کو جہاں قدرت نے حسنِ سیرت سے نوازا تھا وہاں آپ کو بڑی پُر وقار اور جاذبِ نظر شخصیت بھی عطا فرمائی تھی۔ آپ کا قد درمیانی، پیشانی کشادہ، اعضاء متناسب، چہرہ بھرا ہوا۔ اور اس پر خشخاشی مونچھیں، رنگ کھلتا ہوا، چہرے پر ہلکے ہلکے چیچک کے داغ (مگر اتنے زیادہ بھی نہیں جو چہرے کو ہی بدنما بنا دیں) ذہانت سے بھرپور بڑی بڑی آنکھیں، اس پر ٹھہرا ٹھہرا لب و لہجہ آپ کی وجاہت اور شائستگی کا ضامن تھا۔

آپ مشاعروں میں غزلیں تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ مگر الفاظ کی صحت اور معنی کی ادائیگی کا خصوصی لحاظ رکھتے تھے طرزِ تکلم کا یہ عالم تھا۔ بلکہ یہ اعجاز تھا۔ کہ شعر اپنے سحا کاتی انداز سے سامع کو متاثر کرتا تھا۔ اور مشاعرے میں داد و تحسین کی بارش ہو جاتی تھی۔

چنانچہ ندیم صاحب کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے استادِ محترم جناب مولانا سید منظور الحسن صاحب برکاتی فرماتے ہیں :۔

"ندیم صاحب کے کلام میں ایسے اشعار کی کثرت ہے جو براہِ راست دل پر اثر کرتے ہیں کلام میں برجستہ الفاظ و تراکیب کا استعمال بڑے حسین انداز میں موجود ہے۔ بعض اشعار حیات و کائنات جیسے نازک مفاہیم کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں بعض اشعار میں چونکا دینے والی کیفیت بھی پائی جاتی ہے خلوص و محبت کے جذبات نے کلام میں سوز و ساز کی کسک بھی پیدا کر دی ہے جس سے پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

چنانچہ چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں۔؎

کوششیں تھک کے رہ گئیں معرفتِ صفات میں
دخل مگر نہ پا سکا کوئی بھی خاص ذات میں

موت سے اس جہان میں بچ نہیں سکتی زندگی
موت لگی ہے ساتھ ساتھ روز اسی کی گھات میں

مذہبِ عشق میں شکوہ تو ہے اک جرمِ لطیف
عشق کی جنس مگر نالۂ و فریاد نہیں۔

رنج، غم، آفت، مصیبت ہی سے لطفِ عشق ہے
گر نہ ہو سوزِ الم وہ ساز پھر کیا ساز ہے

وہ مجھ کو دیکھتے ہیں ہر گھڑی دز دیدہ نظروں سے
انھیں کیا گر مرے پہلو میں زخم تبر ہو جائے

بے ساختہ سنا دے کوئی مژدۂ نشاط
اس شام غم کی ایسی سحر چاہتا ہوں میں

ندیم صاحب نے ابتداء میں چند غزلیں امام الشعراء حافظ محمد عالمگیر خاں کیفؔ ٹونکی کی خدمت میں پیش کیں اور بعدہٗ تازیست حضرت سید محمود الحسن صاحب صولتؔ ٹونکی سے مشورۂ سخن فرماتے رہے۔ جس کا اعتراف انھوں نے جابجا اپنے مقطعوں میں کیا ہے۔ چنانچہ استاد کیفؔ کے لئے ان کا زاویۂ نظر یہ ہے۔ کہ :-

یہ سچ ہے ندیمؔ اس میں ذرا فرق نہیں ہے
اک کیفؔ سا استاد غزلخواں نہیں دیکھا

ذہنی طور پر استاد صولتؔ سے آپ کس قدر متاثر تھے اس کا اندازہ دونوں شاعروں کے ایک ہی مفہوم پر مشتمل دو شعروں سے لگایا جا سکتا ہے۔

صولتؔ صاحب فرماتے ہیں :-

بام و در مطلع انوار نظر آتے ہیں
ان کے آنے کے سے آثار نظر آتے ہیں

اسی مفہوم کو ندیمؔ صاحب اس طرح ادا فرماتے ہیں :-

وہ ہی وہ ہم کو نظر آتے ہیں گھر میں ہر طرف
آئینہ خانہ ہوئے ہیں بام و در میرے لئے

اور یہ امر قابلِ اعتراض بھی نہیں بلکہ عین فطرت کے مطابق ہے کہ جو طبیعت جس کا اثر قبول کرتی ہے۔ اس کا رنگ کہیں گہرا اور کہیں ہلکا، کلام میں ضرور نظر آتا ہے۔

حضرت ندیمؔ کے اشعار پڑھ کر مجھے بے اختیار انگریزی مفکر سوئنبرن کا یہ قول یاد آگیا۔ کہ :-

"جو کچھ روشنی ہم پر پڑتی ہے یا پڑ سکتی ہے وہ بیرونی اثر سے نہیں بلکہ باطنی اثر ہی پڑتی ہے۔ (اس) لئے کہ ہماری صداقت، ازل کی ابدی شمع ہوتی ہے اور سراج منیر کی ضیاء کے

فیضان کے بغیر انسان کوئی طاقت، کوئی راحت، کوئی صداقت اور کسی بھی رہبری کا ذریعہ اور گناہ سے احتراز کا کوئی بھی طریقہ حاصل نہیں کر سکتا۔"

اگر اس قول کی کسوٹی پر حضرت ندیم کا کلام پرکھا جائے تو وہ نورِ معرفت سے معمور نظر آتا ہے جس کی روشن راہوں میں شاہد و مشہود ایک ہی ہو گئے ہیں ؎

ہیں جب مشہود و شاہد ایک ہی راہِ حقیقت میں
تو مجنوں سے جدا کیوں لیلیٰ محمل سمجھتے ہیں

صانعِ قدرت کی صناعی نمایاں دیکھئے
اپنی صورت غور سے گر اہلِ عرفاں دیکھئے

کبھی کبھی اس جادۂ منزل میں وہ سخت مقام بھی آتا ہے کہ آپ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں ؎

کوششیں تھک کے رہ گئیں معرفت صفات میں
دخل مگر نہ پا سکا کوئی بھی خاص ذات میں

عبودت کی سرافرازی اور مسلک کی اصابت کی یہ پختگی ہے کہ وہ اپنے باب میں رحمت باری کو گوش بر آواز سمجھتے ہیں :- ؎

تیرے اپنے باب میں کیا فکر تجھ کو اے ندیمؔ
رحمت باری ہی جب خود گوش بر آواز ہے

یہی عالم جناب سرورِ کائنات نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت و محبت کا ہے وہ حضرت کی ذاتِ گرامی کو کل کائنات کے لئے بحرِ عطا اور قلزم جود و سخا سمجھتے ہیں :-

سیراب فیض عام سے ہے آپ کے جہاں
بحرِ عطاء و قلزم جود و سخا ہیں آپ

بخشش نہ تیری چاہیں گے کس طرح اے ندیم
ہاں بخشش دینے والے ہی جرم و خطا ہیں آپ

ندیم صاحب کے کلام میں محض زاہد خشک کا تصوف ہی نہیں ہے بلکہ سرزمین عشق ٹونک کی آب و ہوا سے سیراب جولانئ طبع اور زندہ دلی کی موجیں بھی ہیں چنانچہ کہیں کہیں بڑے تغزل آفریں شعر بھی فرما گئے ہیں۔ لہٰذا بطور مشتے نمونہ از خروارے چند شعر ملاحظہ ہوں :-

دل کی دنیا میں عجب ہنگامہ برپا کر دیا
کس بلا کا فتنہ زا، نازِ بُتِ طناز ہے

ہر جا ہے گلستاں میں نمو غنچوں کا
حسنِ معصوم نے لی ہے کبھی انگڑائی بھی

عیر کہتا ہے فقط قربان جانے کے لئے
چاہیئے دل جان کی بازی لگانے کیلئے

نگاہ ناز نے کچھ التفات ہی نہ کیا
وگرنہ جاں تھی قربان عمر بھر کے لئے

ندیم صاحب صرف غزل گو شاعر نہیں تھے بلکہ انھوں نے نظمیں بھی لکھیں اور خوب سے خوب تر لکھیں ہیں۔ ان کی ایک نظم "بھارت" اور دوسری "یوم جمہوریت" میں جہاں وطن پرستی کے سوتے ابلتے نظر آتے ہیں وہاں "کسان" جیسی نظم میں دورِ حاضرہ کے مسائل پر بھی بصیرت افروز تبصرہ پیش کیا گیا ہے۔

آپ ایک کامیاب نظم گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجہ کے نثر نگار بھی تھے۔ چنانچہ آپ کی نثر میں ایک لطیف شعریت پائی جاتی ہے آپ کو الفاظ کے زیر و بم کے استعمال کا طریقہ اور مضمون کو موضوع کے لحاظ سے شاہکار بنا دینے کا گر بھی یاد تھا۔ مگر افسوس اس امر کا ہے کہ آپ کے مضامین کا پتہ نہیں چلتا۔ کہ ان کا کیا حشر ہوا۔؟

راقم الحروف کو آپ نے مندرجہ ذیل مقالات ضرور سنائے تھے۔!

۱۔ کیا تاج محل شیو مندر تھا۔؟
۲۔ بساون لال شاداں اور نواب امیر خاں۔
۳۔ اختر اور اس کی شاعری

اس کے علاوہ آپ نے "امیر نامہ" جو فارسی زبان میں ہے اس کا ہندی زبان میں ترجمہ کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ اور اس کے کئی باب بھی مکمل کر چکے تھے۔ امید ہے کہ ہنومان سنگھل مذکورہ مضامین کو زیور طبع سے آراستہ فرما کر شیدائیانِ اردو کو اپنا گرویدہ بنائے رکھیں گے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ماسٹر رام نواس صاحب ندیم اپنی ذات میں خود ایک انجمن تھے۔ وہ اپنے آپ میں خود ایک زندہ عہد تھے۔ ان کی شخصیت ایک عہد آفریں شخصیت تھی وہ زندگی بھر درس و تدریس کے ذریعہ خدمت خلق کرتے رہے اور بالآخر ماہ جنوری سنہ ۱۹۹۵ء میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے اور دیار ٹونک کے قصر العلم کا ایک عالی شان باب ہمیشہ ہمیش کے لئے بند ہو گیا۔ ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

بقیہ "میرے دادا حضور" صفحہ ۱۸ سے آگے

میں اپنے مرحوم دادا حضور کو جب کہ ان کے بارے میں یہ کتاب ندیم کے خاص نمبر کے نام سے مرتب کر کے شائع کی جا رہی ہے۔ ان کی تمام اعلیٰ خدمات اور ادب نوازی کے لئے اپنی بے پناہ محبت کے ساتھ خراج عقیدت پیش کر رہا ہوں۔

از :- ہنومان سنگھل

یادوں کے چراغ

اس جہان فانی میں لوگ آتے ہیں کچھ عرصہ ٹھہرتے ہیں اور پھر ملک عدم کو چلے جاتے ہیں۔ مگر اپنے پسماندگان کے لئے اپنی زندگی کی چند یادیں چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں میرے والد بزرگوار کا شمار ہے۔ میرے والد محترم کے انتقال کو تقریباً بیس سال گزر چکے ہیں لیکن آج بھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہو۔

میرے والد محترم جناب ماسٹر رام نواس جی ندیم مرحوم ایک ممتاز شخصیت اور حیثیت کے مالک تھے اردو و فارسی میں تو وہ ایم اے تھے ہی لیکن ہندی اور انگریزی میں بھی انھیں خاصی مہارت حاصل تھی مطالعے کا انھیں زبردست شوق تھا۔ ہر روز کوئی نئی کتاب ان کے ہاتھوں میں ہوتی تھی۔ حالانکہ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ان کے ذرائع معاش کم ہو جانے کے سبب کاروباری سلسلہ میں ان کی مصروفیات بڑھ گئی تھیں مگر پھر بھی ان کا ادبی ذوق و شوق رتی برابر بھی کم نہیں ہوا تھا۔

آج کا عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، اس زمانے میں ادارہ "راجستھان قدیمی تعلیم" —— राजस्थान प्राच्य विद्या संस्थान کے زیر اثر لوہاروں کی گلی میں واقع تھا اور جناب شوکت صاحب اس کے انچارج تھے اور میرے والد بزرگوار کے چند اچھے اور ہونہار شاگردوں میں سے ایک تھے۔ اکثر بیشتر میرے والد صاحب کا وہاں آنا جانا رہتا تھا اسی وقت انھوں نے چند فارسی کتب کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ جو بدنصیبی سے آج میرے پاس محفوظ نہیں ہے۔

میرے والد بزرگوار جب محکمہ آرکائز میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔ تو انھوں نے راجستھان میں دستیاب ہونے والی فارسی و عربی قلمی کتب کا کیٹیلاگ بھی مرتب کیا تھا۔ جو شائع بھی ہوا تھا اسی کے دوران انھوں نے منشی بساون لال کے تحریر کردہ امیر نامہ فارسی کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا لیکن وہ بیماری کے باعث پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ ادھورا ہی رہ گیا۔

ریاست ٹونک کے ادبی ماحول نے میرے والد محترم کو ایک کامیاب شاعر بنا دیا تھا اور نامور اساتذہ

کی صحبت نے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو ابھرنے کے زریں مواقع فراہم کئے تھے ۔ موصوف نے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی کہی ہیں ۔ اور نثر میں بھی ان کی کچھ تصانیف منظر عام پر آئی ہیں ۔

ان کے کلام کی خصوصیات میں زبان کی سلاست ، روزمرہ اور محاورات کا استعمال اور وہ بھی نہایت خوبی کے ساتھ ، یہ سب چیزیں بطور خاص قابل ذکر ہیں ۔ وہ زبان کے رموز و نکات سے خوب واقف تھے ۔ ان کا کلام عروض اور قواعد کے سانچوں میں ڈھلا ہوا نظر آتا ہے ۔ اپنے اشعار میں انھوں نے کہیں کہیں ہندی الفاظ کا بھی موزوں اور مناسب استعمال کیا ہے ۔ بحیثیت مجموعی ان کے کلام میں جدید و قدیم رنگ ایک حسین امتزاج پایا جاتا ہے ۔

میرے والد صاحب شاعری کے میدان میں استاد شوکت سے مشورہ لیا کرتے تھے ۔ شوکت صاحب اکثر ان کے پاس بیٹھتے تھے ۔ شوکت صاحب چھوٹے قد کے ، بوڑھے ایک خوشنما انسان اور مایۂ ناز شاعر تھے ۔ ان کا مذاق بڑا اچھا اور ان کا طنز بڑا لطیف اور تیکھا ہوتا تھا ۔

میرے والد بزرگوار کی فطرت بڑی سخت تھی ۔ حکم عدولی ، لاپرواہی ، اور جھوٹ انھیں مطلق گوارا نہیں ہوتی تھی ۔ ہم سب بہن بھائیوں سے وہ بے پناہ محبت کرتے تھے ویسے بھی وہ ایک عالم کے لئے پیار کی ایک خوشنما مورتی تھے مجھ سے انھیں کچھ زیادہ ہی انس تھا ، کیونکہ میں ان کا اکلوتا فرزند تھا ۔ ایک واقعہ جس نے ان کی زندگی کی تصویر کو بدل دیا تھا اور ان کے خیالات میں ناامیدی بھر دی تھی وہ تھا میرے بڑے بھائی مہادیو کی اچانک موت ۔ یہ واقعہ بہت ہی دلخراش تھا ۔ کہ تیج کے میلے میں میرے بھائی اور ان کے چند دوست کشتی میں سیر کر رہے تھے ۔ کہ اچانک کشتی الٹ گئی اور میرے بھائی کو موت نے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا ۔ اس واقعہ نے والد صاحب کے حوصلے پست کر دیئے ان کی ہمت توڑ دی اور انھیں اس طرح توڑ مروڑ دیا ۔ کہ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھر کبھی نہیں بکھری کیونکہ ان کے دل کے اندر تو غموں کے طوفان امنڈتے رہتے تھے ۔

میرے والد بزرگوار کی زندگی واقعات کا ایک خزانہ تھی ۔ ان کا جب بھی ٹونک سے چھبڑہ یا سرنج تبادلہ ہوا ۔ انھیں ملازمت سے استعفیٰ دینا پڑا ۔ کیونکہ وہ بھی میری طرح اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے اور ان سے بھی ان کے والد بے پناہ محبت کیا کرتے تھے ۔

میرے دادا حضور ، لالہ مرلی دھر جی بھی ایک اچھے عالم تھے انھیں گھوڑے کی سواری اور پہلوانی

کا بھی شوق تھا منشی گیری کیا کرتے تھے ۔میری والدہ ماجدہ کا کہنا ہے کہ وہ متھرا سے ٹونک آکر بس گئے تھے ۔میرے دادا جان صبح کے وقت بچوں کو درس دیا کرتے تھے ان کے مکتب میں صرف ہریجنوں کے بچے ہی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے جن کو اس دور میں اور کوئی درس دینا پسند نہیں کرتا تھا ۔میرے والد صاحب پر اس بات کا بھی کافی گہرا اثر پڑا تھا کیونکہ وہ زندگی بھر ہریجنوں کے حامیوں میں رہے تھے ۔تقریباً ۱۹۲۵ء میں میٹریکلیشن کے بعد وہ دربار ہائی اسکول میں معلم بن گئے ۔۱۹۳۵ء میں وہ پی ۔ڈبلیو ڈی میں اکاؤنٹینٹ ہو گئے اور اس کے بعد پھر ماسٹری لائن میں لوٹ آئے ۔آزادی کے وقت وہ اوڈیٹا میں تھے اور نہا ولے پر اودے پور بھی گئے تھے ۔

ریٹائرمینٹ کے وقت ان کا تبادلہ جے پور سے بیکانیر ہو گیا تھا ۔اس لئے انھوں نے ملازمت سے سبکدوش ہونا ہی زیادہ مناسب سمجھا ۔۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۸ء وہ امیارہ ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر بھی رہے تھے ۔

میرے والد بزرگوار کے شاگرد ہزاروں کی تعداد میں ہیں ۔وہ اس زمانے میں ایک معلم تھے جب پورے شہر میں ہی گنے چنے ماسٹر ہوا کرتے تھے ۔وہ اپنے طلبا کا پوری طرح سے خیال رکھتے تھے ان کے پڑھائے ہوئے کافی لوگ اس وقت پاکستان اور بیرونِ ہند میں مقیم ہیں ۔جن کے عقیدت سے بھرپور خطوط آج بھی مجھے ملتے رہتے ہیں ۔

میرے والد صاحب مرحوم کا غصہ بہت ہی تیز تھا ۔وہ غصہ کی حالت میں آپے سے باہر ہو جاتے تھے جس وقت انھیں پہلی بار ہارٹ اٹیک ہوا ہے اس روز صبح ہی وہ ایک شخص پر سخت ناراض ہوئے تھے اور شام ہی کو ان کی طبیعت سخت خراب ہو گئی تھی ۔لیکن فرو ہو جانے کے بعد وہ متعلقہ لوگوں سے معافی بھی مانگ لیا کرتے تھے ۔

ان گنت یادیں ہیں ان کی اور ان گنت باتیں ۔جو آج میرے ذہن میں ایک کے بعد ایک ابھر رہی ہیں ۔سوچتا ہوں ۔یادوں کی برات کے عنوان سے ایک کتاب لکھ دوں جس میں ان کی زندگی کے تمام خاص خاص واقعات کو یکجا جمع کر دیا جائے ۔

عزیز اللہ شیرانی - علی گنج ٹونک

تہذیب و روایت کا شاعر

ماسٹر رام نواس ندیم

ہم اپنے نامور اسلاف کی زندہ نشانی ہیں
رہے لیکن ہمارا ادھر بیں نام و نشاں کب تک
ندیم

ریاست ٹونک کی گزشتہ ایک سو پینسٹھ سالہ ادبی خدمات کی تاریخ تذکرۃ الیقین شعر و ادب کو اس دور سے متعارف کراتی ہے جس میں نواب امیر الدولہ بہادر اول فرماں روائے ٹونک (۱۸۱۷ء تا ۱۸۳۴ء) نے ٹونک میں اردو ادب کی خدمات کا سلسلہ شروع کیا اور دربار ٹونک شعر و سخن کے نغموں سے گونجنے لگا۔ ایسے خوشگوار ماحول سے ذی شعور حضرات کے ذوق سخن کو ایسا پروان چڑھایا کہ انیسویں صدی ختم ہوتے ہوتے ٹونک میں شعرا کی کثیر تعداد نظر آنے لگی۔

نواب محمد سعادت علی خاں بہادر سعید، پنجم فرماں روائے ٹونک (۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۷ء) کے دور میں ایسا شاعرانہ ماحول قائم ہوا کہ نہ صرف خواتین بلکہ مختلف مذہبی فکر کے حامل حضرات بھی شعر و شاعری کے رجحان سے متاثر ہوئے اور انھوں نے اردو شاعری کی روایت کو برقرار رکھا۔

نواب صاحب کی جانب سے کی گئی غیر مسلم ادبا اور شعراء کی حوصلہ افزائی نے ریاست میں ہندو مسلم اتحاد قائم رکھا۔ ایسی پُر امن فضا میں منشی مُرلی دھر جی اگروال متھرا سے ٹونک آئے۔ ان کے یہاں ماسٹر رام نواس جی ندیم نے ۱۹۰۶ء میں جنم لیا۔

یہ وہ دور تھا جب ٹونک کے علماء و فضلا حضرات ٹونک اور بیرون ٹونک میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے

مرلی دھر جی بھی یہ چاہتے تھے کہ وہ اپنے فرزند کو بھی اعلیٰ تعلیم دلائیں۔ لہٰذا مولانا یوسف خاں صاحب کے پاس فارسی تعلیم کے لئے حضرت ندیم جانے لگے۔

حسنِ اتفاق سے اسی زمانے میں مولوی محمد عمر خاں نازش ٹونکی اورینٹل کالج لاہور سے فارسی کے پروفیسر کے عہدے سے پنشن لے کر ٹونک آگئے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب کا شمار ہندوستان کے مشہور اساتذۂ فارسی میں ہوتا تھا۔ ان کی دو اہم تصانیف "فارسی زبان کی تاریخ" اور "فارسی علم وادب" اورینٹل کالج لاہور میں فارسی میں بی اے کے نصاب میں شامل تھیں۔

اسے ماسٹر رام نواس جی کی خوش قسمتی ہی کہنا چاہیئے۔ کہ انھیں مولوی محمد عمر خاں نازش کی سرپرستی بھی حاصل ہوئی۔

جب رام نواس جی کو شعر گوئی کا ذوق پیدا ہوا تو امام الشعراء حافظ محمد عالمگیر خاں کیف ٹونکی کو اپنا استاد بنایا۔ جن کا شمار ٹونک کے معزز شاعروں میں ہوتا تھا۔ کیف کی یہ خصوصیت تھی کہ انھوں نے اردو شاعری میں تصوف و اخلاق کو موضوعِ سخن بنایا۔

رام نواس جی نے اپنے اساتذہ کی بے پناہ شفقتوں کا دل سے احترام کیا اور اساتذہ کی بتائی ہوئی راہوں پر گامزن ہوئے تحصیلِ علم سے فراغت کے بعد ایک شاعر اور مدرس کی حیثیت سے منظر عام پر آئے اور دنیائے شاعری میں ندیم کہلائے۔

ندیم اس دور کے شاعر تھے جہاں شاعر اپنے ذہن، تخیل اور تخلیق کو فن کی روایتی بندشوں میں جکڑا ہوا محسوس کرتا تھا۔ اور اس پر فخر کرتا تھا اور مختلف حادثات و واقعات کی ترجمانی رومانی انداز سے ہی کر دیا کرتا تھا۔ اور ماضی کی حسین یادگاروں میں کھو جاتا تھا۔

ندیم کا شمار بھی ایسے ہی شاعروں میں ہوتا ہے جنھوں نے قدیم شعراء کے اثرات قبول کئے اور مختلف کیفیاتِ قلبی واردات کا اظہار کیا۔ اور وصالِ یار کے رنگین خواب دیکھے۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

وصالِ یار کی یارب کوئی تدبیر ہو جائے ‏ ‏ ‏ کبھی یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر ہو جائے

بیٹھ جاتا ہوں کہیں تیرا تصور باندھ کر ‏ ‏ ‏ رنج و غم سے خود کو یوں آزاد کر لیتا ہوں میں

آتے ہی تری بزم میں اے رونقِ محفل　　پروانہ سرِ شمعِ شبستاں نہیں دیکھا

ندیم رونق محفل اور شعر و ادب کے اتنے گرویدہ تھے کہ انھوں نے اپنی زندگی شعر و شاعری میں گزار دی اور آخری عمر میں حقیقت سے کچھ اس طرح پردہ اٹھاتے ہیں۔ ؎

ہستی کو راہِ مجازی ہی میں مٹا دینا بھی
یہ بھی ہے رازِ حقیقت مجھے معلوم نہ تھا

ندیم راہِ مجازی میں ذوق دید کی خاطر تمام عمر محبوب کی خاطر و مدارات میں مشغول رہے جیسے وہ اپنے ایک شعر میں بیان کرتے ہیں۔ ؎

وہ خاطر میں اپنی نہ لائے نہ لائے　　بہت ہم نے خاطر مدارات کر لی۔

ندیم کا یہ ایمان کامل تھا۔ کہ غزل میں محبوب کا تصور خالص عشق کی کیفیت کو اجاگر کرتا ہے خواہ وہ حقیقی ہو یا مجازی۔ اگرچہ وہ دونوں پر ہی کاربند رہے لیکن شعوری طور پر وہ محبوب کے خط و خال حسن ازل اور نظام ہستی کی نیرنگیوں میں تلاش کرتے ہیں اور مروجہ تشبیہات و استعارات کا سہارا لے کر روایتی محبوب کے خال رخ اور دام زلف میں الجھے رہنا ہی پسند کرتے ہیں۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

وہ خالِ رخ، وہ دامِ زلف اس کو اب دانہ ہیں　　ندیم اس مرغِ دل کی خیر، بنیا بانہ آتا ہے

بھلا عشق و ہوس کا فرق کیا غافل سمجھتے ہیں
مقام حق و باطل صرف اہلِ دل سمجھتے ہیں

دم جوڑ کتا ہے الجھنوں سے ندیم　　زلفیں شاید وہ پھر پریشاں ہیں

وہ محبوب کے ہاتھوں قتل ہونے سے بھی نہیں گھبراتے اور محبوب کی عتاب آگیں نظروں کو اس کے بدگماں ہو جانے کے خوف سے قبول کر لیتے ہیں۔ اور عشق کی امتحاں گاہ میں قتل ہونے کی تمنا، اور اس تمنا کی تکمیل کے لئے حوصلہ پیدا کرتے ہیں: ؎

کہتی ہے ان کی عتاب آگیں نظر میرے لئے
حوصلہ پیدا کریں قلب و جگر میرے لئے

مدت سے میرے دل میں تمنائے قتل ہے   وہ آزمائے تیغ و تبر، چاہتا ہوں میں

اور جب ان کی آزمائشوں کا سلسلہ شروع ہو کر کافی طویل ہو جاتا ہے تو پھر وہ جفاؤں سے چھٹکارا
چاہنے لگتے ہیں اور یہ التجا کرتے ہیں کہ یہ آزمائشیں کب تک ہوتی رہیں گی :- ے

ستاؤ گے جفاؤں سے ہمیں اے مہرباں کب تک
ہماری اس وفاداری کا لوگے امتحاں کب تک

وہ امتحانِ وفاداری کا تمام عمر پاس بھی رکھتے ہیں اور محبوب کی خاطر غم بھی برداشت کرتے ہیں ا
ضبط و تحمل سے بھی کام لیتے ہیں اور جور و جفا کے تیر بھی کھاتے ہیں۔ پھر بھی حادثاتِ زمانہ کے مقابلے میں
محبوب کے غم کو ہی ترجیح دیتے ہیں :- ے

زمانے کے حوادث کیا اثر انداز ہوں ان پر
طبیعت جن کی تیرے ناز تیرے غم اٹھاتی ہے

ندیم، شاعرِ رومان حضرت اختر شیرانی سے بھی کسی حد تک متاثر تھے کیوں کہ اختر ان کے ہم عمر ہونے کے
ساتھ ساتھ ان کے ہم وطن بھی تھے۔ اختر کا رومان شباب پر تھا۔ اور وہ شاعری میں عورت کے تصور کو عام
کر چکے تھے لیکن ان کی تحریک نے زور نہیں پکڑا تھا کیوں کہ اس وقت تک ادباء اور شعراء روایت کے معترف
تھے اور کلاسیکی شاعری کی جڑیں اتنی مضبوط اور پھیلی ہوئی تھیں کہ انھیں آسانی سے اکھاڑ پھینکنا ناممکن
تھا اس لئے ندیم نے بھی روایت کا اعتراف کیا۔ اور عورت کا براہِ راست تصور اپنی غزلوں میں پیش نہیں
بلکہ اشارات اور رمز و کنایات ہی سے کام لیا۔

ندیم نے غیر مسلم ہونے کے باوجود مروجہ روایات اور اصنافِ سخن (حمد و نعت) وغیرہ کو بھی نظر انداز
نہیں کیا۔ وہ حمد باری تعالیٰ میں داخلی کیفیت کا سرور کس حسن عقیدت سے پیش کرتے ہیں ملاحظہ ہو۔

تو بیاباں کو بھی گلزار بنا دیتا ہے
کیا قیامت ہے ترے حسن کی رعنائی بھی

ندیم نے اپنے عزیز و اقرباء، دوستوں اور اپنے حکام کی مدح میں قصائد بھی لکھے ہیں جن میں حسب مراتب القاب و آداب اور موقع و محل کی مناسبت سے منظر نگاری کے حسین و جمیل نمونے ملتے ہیں لیکن کہیں کہیں مبالغہ آرائی کی پرچھائیاں بھی نظر آتی ہیں۔

انھوں نے ایک قصیدہ بموقعۂ مسند نشینی ہز ہائینس نواب **محمد** فاروق علی خاں بہادر ششتم فرماں روائے ٹونک (۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۸ء) کی مدح میں لکھا ہے۔ قصیدے کی ابتداء اس شعر سے کرتے ہیں ؎

ہلال عید کو حاصل ہوا شرف جو کمال
وہ تیری تخت نشینی سے ہے شہا امسال

نواب **محمد** سعادت علی خاں بہادر، پنجم فرماں روائے ٹونک کی شان میں بھی ایک قصیدہ لکھا ہے جس کے آخر میں نسبتِ فخر ندیمانہ ملاحظہ کیجئے۔ ؎

اس ندیم تیرے نمک خوار کو تیرے در سے
نسبت فخر ندیمانہ مبارک باشد

نوابوں کی مدح میں لکھے گئے تمام قصائد تاریخی حیثیت کے حامل ہیں۔ تمام قصائد میں نوابین ٹونک، اور دربار کی شان و شوکت بیان کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں ندیم نے جناب شیو شنکر جی تیواڑی (چیرمین پبلک سروس کمیشن گورنمنٹ راجستھان جے پور) کی دختر کی شادی کے موقعہ پر تہنیت نامہ لکھا۔ جس میں وہ شادی کے خوبصورت مناظر موسیقی اور دلآویز فضا سے محظوظ ہو کر فرماتے ہیں۔ ؎

جشن جمشیدی نہ کیوں آئے نظر
اہل دانش نے کیا ہے انتظام

ندیم نے کئی نظمیں بھی لکھیں، ان کی کچھ نظمیں ملک کی آزادی سے بھرپور خوشی کے جذبات سے معمور نظر آتی ہیں۔ "وہ بھارت" اور "یوم جمہوریت" نظموں میں باشندگان ملک کو اتحاد و اتفاق کی ہدایت کرتے ہیں۔

ان کی نظموں میں "زراعت کی ترغیب" بہت کامیاب اور کارآمد نظم ہے جس میں کسانوں کو کھیتی کی اہمیت اور ٹھیک ڈھنگ سے کھیتی کرنے کی ہدایت دی گئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ندیم، کسان اور مزدور کے درد کو کما حقہ محسوس کرتے تھے۔

اس نظم کی اہمیت وافادیت کو مدنظر رکھ کر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ کہ ندیم کی یہ نظم ابتدائی اضافی کتب میں شامل کرلی جائے۔ تو اس سے راجستھان میں اردو کی فضا کو تقویت ملے گی۔

یہ بات شاید بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ کہ رام نواس جی اپنے زمانہ ملازمت میں تصنیف و تالیف سے بہت دلچسپی رکھتے تھے جس کے صلے میں انھیں راجستھان پاٹھیہ پستک منڈل جے پور سے شائع ہونے والی درجہ آٹھ کی کتاب "راجستھان اردو ریڈر" کے مؤلفین میں شامل کیا گیا اس کتاب کے دیگر مؤلفین، جناب آئی ڈی رضوی، جناب محمد علی زیدی، جناب محمد بخش ذہین، اور جناب بہاری لال ماتھر ہیں۔

ندیم صاحب کی ادبی خدمات کا جائزہ لینے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے۔ کہ ٹونک میں اردو کے ادبی ماحول اور سرکاری سرپرستی نے بلاکسی مذہبی تفریق کے اردو کو فروغ دیا۔ اور رام نواس جی ندیم اسی ادبی ماحول کے ترجمان ہیں جہاں روایت وتہذیب کا آج بھی بڑا احترام کیا جاتا ہے ۔۔ ۵۵

قیصر رشید بھارتی - امیر گنج ٹونک

ندیمؔ، ایک فنکار

اک پجاری تھا ادب کا وہ سخن ور شاعر
تھا جو اردوئے معلی کا سمندر شاعر
مخزنِ علم وہ انسان وہ بشر آج نہیں
شخصیت اس کی تعارف کی بھی محتاج نہیں

لیکن میں روشنائی کی ایک بوند سے علم و ادب کے اس لامحدود سمندر کی ایک دھندلی سی تصویر صفحۂ قرطاس پر بنانے کی جرأت کر رہا ہوں - ادب کے اس پجاری کی جس نے علم و ادب کی خدمت کے ذریعہ خدمتِ خلق کو اپنا شیوہ جانا - اور آج دنیا، دستور کے مطابق ان کو اور ان کی تمام اعلیٰ علمی خدمات کو بھلا بیٹھی ہے -

اپنے اس ناچیز قلم کے سہارے نہ صرف ان کی [illegible] دلی جذبات کی شکل میں تازہ کر رہا ہوں بلکہ ان کی زندگی سے وابستہ تمام حقیقتوں کی عکاسی کرنے کی بھی کوشش کر رہا ہوں -

آنجہانی ماسٹر رام نواس جی ندیم اگروال ۱۹۰۶ء میں جناب لالہ مرلی دھر جی اگروال کے گھر میں ان کے خاندان کی اندھیری دنیا میں ایک روشن چراغ بن کر آئے کہتے ہیں کہ ان کی پیدائش ان کے والدین کے لیے ایک پیامِ مسرت و شادمانی لے کر آئی تھی -

دستور کے مطابق جناب رام نواس جی کی تعلیم کا آغاز، ان کے والد بزرگوار کی خواہش کے مطابق سنسکرت اور عربی و فارسی سے ہوا - بعد میں جناب مولوی یوسف صاحب مرحوم کے اعلیٰ کردار، صحبت اور تعلیم و تربیت نے اس چراغ ادبی کو آفتابِ ادب بنانے کی بنیاد رکھی اور پھر ایک کے بعد دوسرے اساتذہ کی تعلیم و تربیت اور مصاحبت کے رنگ میں رنگتے رنگتے اردو اور فارسی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کر لی

علم و ادب کے لامحدود ذوق و شوق، لگن، اور محنت نے جب انھیں علم و ادب کا خزانہ بنا دیا۔ تو اسی کی مدد سے وہ خدمت خلق پر گامزن ہوئے اور ایک اعلیٰ درجہ کے معلم بن گئے۔ ٹونک، سرونج، ایباؔ اور دیگر مقامات پر علم و ادب کی خدمت کرکے آپنے اندھیروں میں بھٹکتے ہوئے ہزاروں خاندانوں کی زندگی میں چراغاں کیا۔ آپ کے شاگردوں کی کثیر تعداد آج بھی ملکی و غیر ملکی اعلیٰ ترین عہدوں پہ فائز ہے اور جناب رام نواس جی ندیم صاحب اگروال کے لئے دل کے کسی نہ کسی گوشے میں عقیدت کا ایک چھوٹا سا مندر ضرور بنائے ہوئے ہیں۔

۱۹۷۱ء میں وہ ہائی اسکول کے پرنسپل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے اور ٹونک ہی میں اپنی قیام گاہ میں پرسکون زندگی بسر کرنے لگے۔ لیکن ادب و علم کے ذریعہ خدمت خلق کا دامن آپ نے زندگی کی آخری سانس تک بھی نہیں چھوڑا۔

ماحول کی موافقت، معاشرے کی حالت، قوم کی چاہت، ادب کی خدمت، اساتذہ کی مفاحبت، جذبۂ محبت اور شاعرانہ فطرت نے جناب رام نواس جی ندیم کو ایک کامیاب اور مکمل شاعر بنا دیا۔

آپ نے اپنا تخلص ندیم رکھا۔ دنیائے شاعری میں قدم رکھتے ہی اپنے دور کے نام ور شاعر حضرت حافظ محمد عالمگیر خاں استاد کیف ٹونکی سے اصلاح سخن لینی شروع کی۔ ان کی وفات کے بعد حضرت سہیلؔ اور عاشق مرحوم کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ اور سب کے آخر میں مشہور و معروف استاد شاعر حضرت سولتؔ مرحوم کی زیر نگرانی اپنی کاوش خیال کی تکمیل کرتے رہے۔ اور اس طرح وقت کے ساتھ خود بھی ایک کامیاب ترین شاعر کی حیثیت سے منظر عام پر ابھرے۔ جس کے دھندلے سے چند نشانات آج بھی تاریخ ادب کا ایک رنگین باب بنے ہوئے شعور و احساس کو دعوتِ مطالعہ دے رہے ہیں۔

حضرت ندیم نے ماضی و حال کے اساتذہ کے نقش پا پہ گامزن ہو کر چند مخصوص بحروں کو خاص طور پر اپنے کلام کے لئے چنا اور کثرت سے ان کا استعمال کیا ہے۔ اگرچہ دیگر غیر مخصوص بحروں کو بھی انھوں نے استعمال کیا ہے مگر بہت ہی کم۔ اس لئے میں یہاں ان چند مخصوص بحروں ہی کا ذکر کروں گا جن کے سہارے حضرت ندیم کا کلام اور دیوان پایۂ تکمیل تک پہنچا ہے۔ وہ خاص بحریں مندرجہ ذیل ہیں۔

بحر رمل

جس کے بارے میں۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کا استعمال اردو کے ہر بڑے شاعر نے فخر کے ساتھ کیا ہے اور آج تو یہ بحر مقبولیت کے چوتھے آسمان پر،

قلابازیاں لگا رہی ہو۔ کیا شکیل، کیا ساحر، کیا تاباں، کیا ماہر، کیا خمار، کیا مخمور، آج کے دور میں شاید ہی کوئی بڑا شاعر ایسا ہو جو بحرِ رمل کو جانِ بحر تصور نہ کرتا ہو۔ اور پھر بڑے شعراء پر ہی کچھ منحصر نہیں بلکہ چھوٹے سے چھوٹا، عام سے عام اور نا ماہر سے اناڑی غرض ہر شاعر ہی ایسے اس بحر کا دم و دیوانہ نظر آتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ خواہ لکھنے والے کو یہ پتہ نہ ہو کہ وہ کس بحر اور کس زمین میں لکھ رہا ہے مگر لکیر کے فقیر کے مصداق فیشن کے مطابق لکھتا اسی بحر میں ہے۔ حضرت ندیم نے بھی اپنے بیشتر کلام کو اسی بحر کے زیور سے آراستہ و پیراستہ کیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا۔ کہ حضرت ندیم کا پچاس فی صد کلام اسی بحر کی ہو بہو تعمیر کیا ہوا ایک خوبصورت محل ہے۔ اس کا پورا نام اور وزن یہ ہے۔

بحر رمل مثمن محذوف:۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

ایک مصرعہ کے لئے۔

نمونے کے اشعار:۔

آج جس کو مال اور دولت پہ اپنے ناز ہے
کل اسی کے واسطے خواری کا پھر آغاز ہے

سر بسر تصویرِ مایوسی نظر آتی تمھیں
تم اگر آکر مرا حالِ پریشاں دیکھتے

وہ ہی وہ مجھ کو نظر آتے ہیں گھر میں ہر طرف
آئینہ خانہ ہوئے ہیں بام و در میرے لئے

آئے ہو دنیا میں کیا خوشیاں منانے کے لئے
تم یہاں بھیجے گئے ہو غم اٹھانے کے لئے

کہتے ہیں دعویٰ انا الحق کا بیاں اہلِ جہاں
درحقیقت یاد کس کو قصۂ منصور ہے

تیرے غم میں اس طرح ہے دل مرے سینے میں اب
جیسے مرجھایا ہوا اک دانۂ انگور ہے

جب کبھی اس بے وفا کو یاد کر لیتا ہوں میں
راحت و صبر و سکوں برباد کر لیتا ہوں میں

بحرِ رمل مثمن مخبون ابتر۔ فاعلاتُن فَعِلاتُن فَعِلاتُن فَعِلُن
مصرعہ کے اول میں فاعلاتن یا فعلاتن کا۔ اور آخر میں فعلن، فَعِلن، فَعِلات، فَعلان کا اختلاف جائز ہے۔

اس بحر میں حضرت ندیم کے نمونۂ کلام کے طور پر ان کے دیوان کے چند اشعار درج ذیل ہیں

کثرتِ غم میں بھی لب پر مرے فریاد نہیں
خوگرِ عید ہوں میں شائقِ بیداد نہیں

میں نے خوش ہونے کو چھیڑا تھا عدو کا قصہ
وہ سمجھ لے گا شکایت مجھے معلوم نہ تھا

شوکتِ جشنِ ملوکانہ مبارک باشد
عشرتِ شادیٔ شاہانہ مبارک باشد

بحرِ ہزج مثمن سالم:۔ یہ ایک سالم بحر ہے اس کا ہر رکن ہموزن اور برابر ہے ایک مصرعہ کے لئے زیادہ تر چار ارکان کا استعمال کیا جاتا ہے اس بحر میں لکھنے کے لئے شاعر کو کوئی زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی الفاظ بھی اس کے لئے آسانی سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ اگر شاعری کے نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو یہ بحر پہلے نمبر پر آتی ہے لیکن آجکل چونکہ بحرِ رمل کا رواج

زیادہ ہوگیا ہے اس لئے شاعری میں استعمال ہونے والی یہ اب دوسرے نمبر کی بحر بن کر رہ گئی ہے۔

اس بحر کے ایک مصرعہ کے چاروں ارکان مندرجۂ ذیل ہیں :۔

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

اس بحر میں حضرت ندیمؔ کا کلام بھی اس روایت کے مطابق دو نمبر پر ملتا ہے جیسا کہ دوسرے بڑے شعراء حضرات کے دیوانوں میں پایا جاتا ہے۔ اس بحر اور زمین میں حضرت ندیمؔ کے کلام سے بطور نمونۂ کلام میں نے مندرجۂ ذیل اشعار چھانٹے ہیں :۔

بنے جس سے مقدر کاش وہ تدبیر ہو جائے
نتیجہ ہر مری تدبیر کا تقدیر ہو جائے

وہ خال رخ وہ دام زلف اس کو آئے واہیں
ندیمؔ اس مرغ دل کی خبر ہے تا یانہ آتا ہے

کھلے گا کس طرح سے غیر کے مکتوب کا مضموں
صبا کب ان کے کوچے سے ہمارے پاس آتی ہے

ستاؤ گے جفاؤں سے ہمیں اے مہرباں کب تک
ہماری اس وفاداری کا لوگے امتحاں کب تک

بھلا عشق و ہوس کا فرق کب غافل سمجھتے ہیں
مقام حق و باطل صرف اہل دل سمجھتے ہیں

بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف

مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن (ایک مصرعہ کے لئے)

ایک شعر میں مصرعہ کے آخر میں فاعلن (محذوف) اور فاعلات (مقصور) کا اجماع جائز ہے
اس بحر کا استعمال بھی روایت کے انداز میں ہے کیونکہ عام طور سے اس بحر کو بڑے شعراء تیسرے درجہ کی بحر کی
شکل میں استعمال کرتے ہیں۔

اس بحر میں حضرت نسیم کے دیوان سے مندرجۂ ذیل اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

سردار کائنات حبیبؐ خدا ہیں آپ
سرتاج ممکنات و سر انبیاء ہیں آپ

جس کی کبھی سنگ در پہ تمہارے جبیں نہیں
اس نامراد کا تو ٹھکانہ کہیں نہیں

کیا حال پوچھتے ہو دل بے قرار کا
سینے میں میرے گوشہ ہے اک لالہ زار کا

پیوست دل میں تیر نظر چاہتا ہوں میں
خود اپنا امتحان جگر چاہتا ہوں میں

بحر مجتث مثمن مخبون مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن

(ایک مصرعہ کے لئے)

بحر مجتث کے اصل ارکان، مستفعلن فاعلاتن چار بار ایک مصرعہ کے لئے ہے اردو میں بحر سالم
مستعمل نہیں ہے اس بحر میں فعلاتن کی جگہ فاعلاتن یا مفعولن کا استعمال بھی جائز ہے۔

آج کے دور میں یہ بحر بھی بہت عام ہو چکی ہے کہیں کہیں تو اس بحر کو بحر رمل کے بعد دوسرے درجہ پر دیکھا جا سکتا ہے۔ حضرت ندیم نے اس بحر کو زیادہ تو استعمال نہیں کیا۔ مگر ان کے دیوان میں چوتھے نمبر پر اسی بحر کی غزلیں نظر آئیں گی۔ چند غزلوں کے اشعار برائے تسکینِ ذوق پیش ہیں۔

ہماری نظروں میں گر وہ سما گئے ہوتے
تو کائنات کو دل سے بھلا گئے ہوتے

چلی نہ پیش کسی کی ندیم قسمت سے
اگرچہ ہم نے مزے علم اور ہنر کے لئے

بحر خفیف اس بحر کے سالم ارکان **فاعلاتن مستفعلن فاعلاتن** ہیں اہل فارسی ایک رکن مستفعلن اور بڑھا کر اس کو مثمن استعمال کرتے ہیں۔ مگر اردو میں اس کی اصل دور کھنی ہے۔ اور مزاحف ہی ہے۔ مصرع کے شروع میں فاعلاتن اور فعلاتن کا اور مصرعہ کے آخر میں فعلات، فعلان، فعلن، اور فعلن کا اختلاف جائز ہے۔

حضرت ندیم نے اس بحر کو جس شکل میں کام میں لیا ہے۔ وہ مندرجۂ ذیل پائی گئی ہے۔

بحر خفیف مسدس مخبون ۔ ومخبون محذوف فاعلاتن مفاعلن فعلن یا فَعِلُن

اس بحر کی چند غزلیات سے مندرجۂ ذیل اشعار نقل ہیں:۔

زیرِ ابرو جو موئے مژگاں ہیں ہیں وہ نشتر کہ دل میں پیکاں ہیں

ضبط اک دن فغاں نہ ہو جائے وہ کہیں ... ... جائے۔

مندرجۂ بالا بحروں کے علاوہ حضرت ندیم نے جن دیگر بحروں کا استعمال کیا ہے۔ وہ بھی بطورِ نمونہ ہدیۂ ناظرین ہیں:۔

بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف (دیکھئے)

مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

کچھ اس نے علاج شب ہجراں نہیں دیکھا
جس نے کہ ترا حسن فروزاں نہیں دیکھا

بحر متقارب مثمن سالم مضاعف فعولن فعولن فعولن فعولن

(ایک مصرعہ کے لئے)

جہاں مل گئے اک نہ اک بات کرلی
اسی طرح ان سے ملاقات کر لی

بحر رجز مثمن مطوی مخبون مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن

(ایک مصرعہ کے لئے)

اولاً اس بحر کا استعمال مرزا غالب نے کیا تھا۔

بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

یہ ایک مشکل بحر ہے بہت کم لوگ اس کا استعمال کرتے ہیں۔ حضرت ندیم کے دیوان میں ایک غزل اس بحر میں دستیاب ہوئی ہے جس کا ایک شعر حاضرِ خدمت ہے۔

کوششیں تھک کے رہ گئیں معرفت صفات ہیں
دخل مگر نہ پاسکا کوئی بھی خاص ذات ہیں

حضرت ندیم کے کلام پر مشتمل تین دیوانوں میں سے قسمت سے جو چند اوراق ہمیں مل سکے ان میں سے جو کلام اس خاص نمبر میں بعنوان رنگ تغزل پیش کیا گیا ہے اس میں جن جن بحروں کا استعمال کیا گیا ہے ان کا تذکرہ اس مضمون میں کیا جاچکا ہے

آنجہانی شری رام نواس جی ندیم، ٹونک کے ان ممتاز شعراء میں سے ایک تھے جنھوں نے فن کی اندھیری دنیا میں خونِ دل جلا کر چراغاں کیا ہے رام نواس جی ندیم کا احسان ادبی و علمی حلقوں پر رہتی دنیا تک رہے گا اور ان کا نام قائم و دائم رہے گا۔

حضرت ندیم ہر اعتبار سے ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کی غزلوں میں رنگ تغزل کے ساتھ ساتھ اختصار اور برجستگی پائی جاتی ہے۔ آپ کو زبان پر مکمل طور سے قدرت حاصل تھی۔ محاورات کا استعمال بھی کہیں کہیں موجود ہے مگر لطافت میں کچھ کمی سی محسوس ہوتی ہے۔

انھوں نے غزل میں حسن و عشق کے سوا اور مضامین بھی داخل کئے ہیں اور زندگی اور سماج کے ہر ہر پہلو کو بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ کہیں کہیں اور حالات کی دلکشی رنگ پر بھی ہاتھ رکھا ہے جس کی وجہ سے آپ کے کلام کے چند گوشوں میں فلسفیانہ رنگ بھی نظر آتا ہے۔ لیکن حضرت ندیم کے تغزل میں جو تخیل پایا جاتا ہے اس میں کسی محبوب حقیقی کی خوشبو نہیں آتی جب کہ کسی بھی شاعر کے کامیاب ذوقِ شاعری میں جانِ غزل اس کا محبوب ہی یقینی طور پر ہوتا ہے۔

حضرت ندیم کی شاعری کسی محبوب حقیقی کے بغیر پروان چڑھی ہے حالانکہ یقین تو اسی بات کا دلایا گیا ہے۔ کہ پردے کے پیچھے ضرور کوئی محبوب ہے لیکن وصل کی تمنا پوری نہیں ہوئی اور یہ حسرت دل، دل ہی میں رہ گئی۔ ثبوت کے لئے حضرت ندیم کے کلام سے مندرجہ ذیل اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں :—

سن کر وہ چپ ہیں آرزوئے وصل اس طرح
ہاں کا تو ذکر کیا ہے زباں پر نہیں نہیں

رونق ہے دل میں آرزوئے وصل یار سے
ویراں ہے وہ مکاں کہ جس میں مکیں نہیں

وصل جاناں ہو میسر یہ خیال و خواب ہے
بس تصور ہی سے دل کو شاد کر لیتا ہوں میں

حضرت ندیم کے کلام میں مٹھاس تو ہے لیکن درد کی کسک نہیں اس لئے یہ بات نہیں مانی جاسکتی کہ ان کا جان غزل کوئی محبوب حقیقی تھا۔ ہاں ان کے تصور میں خیالی محبوب کے سمائے رہنے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے ذہن کے کسی گوشے میں کسی دوشیزہ کی دھندلی سی تصویر ضرور رہی ہوگی اور وہ من مندر کی دیوی جو صرف ایک خیال کے علاوہ اور کچھ نہ تھی حقیقت کی دنیا میں ان کی زندگی میں کبھی نہیں آئی۔ اور اسی بات کو حضرت ندیم نے بار بار دہرایا ہے۔

بیٹھ جاتا ہوں کہیں تیرا تصور باندھ کر
رنج و غم سے خود کو یوں آزاد کر لیتا ہوں میں

کھینچ لاتا ہوں انھیں اپنے تصور میں ندیم
دل کے ویرانے کو یوں آباد کر لیتا ہوں میں

خواب و خیال کے یہ سلسلے یوں ہی عشق کا ایک باب بناتے رہے:۔

وصالِ یار کی یارب کوئی تدبیر ہو جائے
کبھی یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر ہو جائے

اور آخر میں حالت یوں بنی کہ بس......

دل جگر چھلنی ہوئے تیری نگاہِ ناز سے
اب فقط اک جان باقی ہے نشانے کے لئے

اور انجام جو ہونا تھا وہی ہوا۔

وحشت نے پیرہن سے سبکدوش کر دیا
اب غم نہیں کہ جیب نہیں آستیں نہیں

اور آخر میں خواب و خیال کے اس عشق کی داستان اس شعر پہ ختم ہوئی جہاں زندگی اس جہان فانی کے سفر کو طے کرنے کے بعد ملکِ عدم کو روانہ ہو جاتی ہے:۔

موت نے اس کے سکوں کا دائمی ذمہ لیا
جب یہ دیکھا حال عاشق کا ترے ناساز ہے۔

بہرحال حضرت ندیم کا تمام دیوان، خواہ وہ غزل ہو یا نظم، قصیدہ ہو یا رباعی، گیت ہوں یا قطعات ہر ایک کا تعلق کسی نہ کسی طرح عشق کے لامحدود جذبے سے تھا۔ وہ عشق اور محبت چاہے کسی محبوب کی ہو یا قوم و وطن کی، یا کسی استاد کی، یا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ہو یا خدائے بزرگ و برتر کی۔!

بہرحال محبت تھی اور صرف محبت ۔۔۔۔۔۔ !

غزل کے بعد جب وہ نظم کے میدان میں اترے تو اپنے ہمعصروں سے کسی طرح پیچھے نہ رہے۔ ملک کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر "بھارت" کے عنوان سے نظم لکھی، ہندی زبان پہ فریفتہ ہوئے۔ تو اردو کی زبانی ہندی کی مدح لکھی۔ ملک کی آزادی کی طرف نگاہ اٹھی تو "یوم جمہوریت" کے عنوان سے نظم لکھ کر اپنے عقیدت مندانہ جذبات کا اظہار کیا۔ اور اسی طرح زندگی کے نہ جانے کتنے عنوانات پہ نہ جانے کتنی نظمیں لکھیں۔

ایک نظم اپنے فرزند جناب ہنومان پرشاد سنگھل کی شادی خانہ آبادی کے مبارک موقع پہ لکھی تھی جس میں فارسی ردیف استعمال کی گئی ہے۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔۔۔۔

جشنِ شادیٔ جگر بند   مبارک باشد
خانہ آبادیٔ فرزند   مبارک باشد
ایک مدت سے تمنا تھی   دلوں میں اس کی
بہجتِ عشرتِ دلبند   مبارک باشد
شرف چشم اجابت بدہ یا عبدِ مجیب
از ندیمت سخنے چند   مبارک باشد

حضرت ندیم نے ان گنت غزلیں کہیں لاتعداد نظمیں لکھیں مگر بدقسمتی سے وہ تمام کا تمام ذخیرہ ان کے مداحین کی نذر ہو کر رہ گیا۔ ہمیں ان کا زیادہ کلام دستیاب نہ ہو سکا صرف ایک مختصر سی ڈائری مل سکی۔ جس میں مندرج کلامِ ندیم کے معیارِ شاعری کا اندازہ کرنے کیلئے کافی ہے۔

جب حضرت ندیم قصیدے کی جانب متوجہ ہوئے۔ تو اس انداز سے کہ ایک بار پھر سودا اور ذوق کی یاد تازہ ہو کر رہ گئی زیادہ قابل تعریف بات یہ ہے کہ قصیدہ کے مضمون میں بھی عقیدت کے ساتھ مدح

اور منظر نگاری، نیز رسم و رواج کی بھی تصویر کشی کی ہے۔ ہجو یا پھبتیاں نہیں لکھیں اگرچہ قصائد آپ نے زیادہ نہیں لکھے۔ مگر جو بھی لکھے ہیں خوب اور خوب تر لکھے ہیں۔

نواب صاحب کی گدی نشینی کے موقعہ پر کسی عزیز یا دوست کی شادی کے موقعہ پر امراء اور کسی خاص موقعہ پر، بہرحال جو کچھ بھی لکھا ہے سچائی کو ملحوظ نظر رکھ کر لکھا ہے

اس کے علاوہ حضرت ندیم نے رباعی، قطعات اور خوبصورت گیتوں پر بھی کامیاب اور شاندار طریقے سے طبع آزمائی کی ہے۔

دنیا اور دنیا داری، انسان اور اس کی زندگی سے پرے حضرت ندیم کی فکر شاعری کی پرواز، آسمانوں کے اس پار خدائے بزرگ و برتر کی جانب بھی ہوئی جس تمام عالم کو وجود بخشا۔ آپ نے خلاق دو جہان کے سب بارگاہ میں اپنی شان عبدیت کا اس طرح اظہار کیا۔

تو بیاباں کو بھی گلزار بنا دیتا ہے
کیا قیامت ہے ترے حسن کی رعنائی بھی

اس کی درگاہ سے مایوس نہ ہو دل میں ندیم
اس کی سرکار میں ہو گی تری شنوائی بھی

آپ نے نہ صرف حمد باری ہی لکھی بلکہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے سرشار ہو کر نعت پاک بھی لکھی ہے۔

سردارِ کائنات حبیبِ خدا ہیں آپ
سرتاج ممکنات و سرِ انبیاء ہیں آپ

جس طرح شاعری کے میدان میں حضرت ندیم نے اپنے فن کا لوہا اپنے دور کے اہل ذوق اور اہل ہنر سے منوایا تھا۔ اور فن شاعری میں ہر سمت سے کامیابی کی بے شمار دولت سمیٹی تھی اسی طرح نثر کے میدان میں اتر کر اول درجہ کے نثری مصنفین کی اگلی صف میں آ کھڑے ہوئے

آپ کا نثری ذخیرہ بھی اگرچہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ صرف ایک مضمون اردو میں اور چند خطوط

ہندی ہیں مل سکتے ہیں۔ اردو کا مضمون "اختر اور اس کی شاعری" دیکھ کر ہی ان کے ایک اعلیٰ درجہ کے نثار ہونے کا ثبوت مل جاتا ہے۔

وہ اس زمانے کے شاعر تھے جب قدیم اور جدید دونوں دور اپنے اپنے دائروں میں نمایاں طور سے ابھرے ہوئے تھے۔ مگر حضرت ندیم قدامت پسند گروہ میں شامل ہوئے۔

ہم اپنے نامور اسلاف کی زندہ نشانی ہیں
رہے لیکن ہمارا دہر میں نام و نشاں کب تک

اگرچہ حضرت ندیم کی شاعری کا رجحان پرانی روایت کی جانب تھا۔ لیکن انھیں جدید یت سے کبھی زیادہ دور نہیں کہا جا سکتا۔ مجموعی اعتبار سے حضرت ندیم ایک کامیاب ترین شاعر، نثار اور ایک شفیق استاد تھے اور اوسط درجہ کے سخنور اساتذہ میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔

زندگی کا پرسکون اور کامیاب ترین سفر طے کرنے کے بعد ۱۹۶۵ء کی ایک تاریک رات میں دنیائے علم و ادب کا یہ پروانہ شمع محفل کو ہمیشہ ہمیش کے لئے خیرباد کہہ گیا۔ زندگی اس فن کار عظیم کو اس جہان فانی سے کوچ کرا کے موت کے ہمراہ ملک عدم کو لے گئی جس نے مرتے دم تک اپنے فن کا دامن نہیں چھوڑا اور آج ان کی چند یادوں کے سوا کچھ باقی نہیں۔ افسوس کہ وہ وفات سے پہلے ہی داغ مفارقت دے گئے اور ٹونک ایک ماہر فن شاعر سے اور اردو ادب ایک مایۂ ناز ہستی سے محروم ہو گیا۔

اب جب کہ حضرت ندیم کی یاد میں ان کے فرزند ارجمند جناب ہنومان سنگھل ماہنامہ "ندیم" کا یہ خاص نمبر نکال کر اہل ذوق کی محفل میں ان کی یاد پھر تازہ کر رہے ہیں تو امید قوی ہے۔ کہ وہ لوگ جو حضرت ندیم کو مع ان کی خدمات کے بھلا بیٹھے ہیں ہمیشہ کے لئے اپنے دل و دماغ میں بسا لیں گے اور یہ شمارہ ان لوگوں کے لئے یقیناً ایک بیش بہا تحفہ ثابت ہوگا جو اہل ذوق کی حیثیت سے فن ادب کے میدان میں نئے نئے ابھرے ہیں۔

(از:- مراد سعیدی ٹونکی)

آہ - ماسٹر رام نواس جی صاحب ندیم

اب منایا جا رہا ہے ٹونک میں یوم ندیم
کیا بتاؤں جو تعلق ان سے تھا میرا قدیم

تھے کرم فرما مرے وہ، اور برسوں کے رفیق
رو رہا ہے دل، کہاں سے آئے گا ایسا شفیق

خاندانِ مفتخر میں جب ہوئے پیدا ندیم
مرتبہ اللہ نے پھر دے دیا ان کو عظیم

نیک طینت ان کی ہستی تھی جہاں میں لاکلام
ہند و مسلم ان کا کرتے تھے ہمیشہ احترام

ابتدا سے انتہا تک علم ہی کا ذوق تھا
ان کو تعلیم و تعلّم کا نہایت شوق تھا

علم کی دنیا میں تھے وہ آفتاب و ماہتاب
ان کے فیضِ علم سے ذرّے بنے تھے آفتاب

زندگی بھر درس دینے کا رہا ہی ان کو ذوق
مرتے دم تک بھی نہ چھوٹا ان کے دامن سے یہ شوق

مدرسے کے تھے بہت محبوب ان کو صبح و شام
مدرسے کی زندگی ان کے لئے عیش دوام

مدرسے سے مل گئی فرصت تو وہ عالی مقام
دیکھتے تھے عرفی و سعدی، نظیری کا کلام

ذات والا آپ کی دلدادۂ رنگ قدیم
ان کو قدرت نے عطا ایسا کیا ذوقِ سلیم

کیا بتاؤں شاعری کا ان کو کتنا ذوق تھا
مرتے دم تک بھی انہیں بس شاعری کا شوق تھا

فارسی اردو کے عالم، شاعرِ شیریں بیاں
تھے وہ اردو کے معلّم صاحبِ عظمت نشاں

مثنوی ہوتی رباعی ہوتی یا کوئی غزل
نظم کر لیتے اسے جب چاہتے وہ برمحل

در حقیقت شاعری میں آپ تھے شیریں مقال ، مدح کرتے آپ کی تھے شاعرانِ باکمال

مل گیا تھا ان کی قسمت سے انھیں شاعر عظیم نسبت صولت پہ کتنا فخر کرتے تھے کلیم

شاعری میں حضرت صولت کا جلتا تھا چراغ نسبتِ صولت سے ہر شاعر کا دل تھا باغ باغ

تھے جہانِ ہند میں صولت ہی ایسے نامگار جن کو کہتا تھا زمانہ شاعروں کا "تاجدار"

زینت بزم سخن ، رنگ سخن تھا آپ سے گلفشاں اردو کا گویا سب چمن تھا آپ سے

ہو صفت مجھ سے بیاں کیا گوہر خوش آب کی کیا لکھوں توصیف میں اس جوہرِ نایاب کی

حضرتِ سنگھل سے میری التجا ہے یہ جناب جتنی جلدی ہو سکے چھپوا دو ان کی تم کتاب

اک جگہ پہ جمع کر لو مل سکے جتنا کلام ان کے دیواں کی طباعت کا کرو پھر اہتمام

ایسا دیواں طبع ہو جس کو کہ دیکھے سب جہاں جس سے باقی حشر تک ان کا رہے نام و نشاں

پھر تو رتبے حضرت سنگھل بڑھیں گے آپ کے زندگی میں گر چلے نقش قدم پر باپ کے

نظم ایسی لکھ گئے "نم" شاعر شیریں سخن

تذکرے جس کے رہیں گے انجمن در انجمن

سلیم واصف فرقانی (در صنعتِ توشیح)

آئینۂ ندیم

م محسنِ علم و ادب ہے یوں تری ہستی ندیم
زندگی بھر تو نے کی ہے خدمتِ علمی ندیم

ا اے کہ تھا علم و ادب ہی سے تجھے ہر لمحہ کام
ہر گھڑی اس شغل میں تیری گزرتی تھی ندیم

س سکہ جاری کشورِ علم و ادب میں تھا ترا
تھا تو حرصِ دولت و اقبال سے عاری ندیم

ٹ ٹونک میں علم و ادب کے اے درخشاں آفتاب
تا ابد باقی رہے گی روشنی تیری ندیم

ر راز تجھ پر علم و فن کے ارتقا کے آشکار
تھا عدیم المثل تیرا درکِ فن دانی ندیم

ر رونقِ بزمِ ادب، شعر و سخن کی جان تھا
اب کہاں گم ہو گئی تیری نوا سنجی ندیم

ا اہلِ فن استاد دونوں کیفؔ و صولتؔ تھے ترے
ہو مثالی کیوں نہ پھر تیری سخن گوئی ندیم

م مل گئے قسمت سے، کامل دونوں استادانِ فن
ان کی ممنونِ کرم ہے تیری فن کاری ندیم

ن نظم و قطعات و قصائد، کیا رباعی کیا غزل
کی ہے ہر صنفِ سخن میں طبع آرائی ندیم

و وہ ترا ذوقِ تعلّم، آفریں صد آفریں
جس کی خاطر ترک کی سرکاری سروس بھی ندیم

ا ابتدا تا انتہا علمی مشاغل ہی سے کام
یہ ہی خدمت زندگی کا تیری حاصل تھی ندیم

س سر بسر اک مردِ پابندِ روایاتِ کہن
تجھ کو تھے مرغوب شاعر عرفی و سعدی ندیم

ن ناز کرتے تھے معاصر تیرے، تیری ذات پر
کیونکہ تھی ضرب المثل تیری رواداری ندیم

د دولتِ علمی سے تیرے ذہن و دل تھے مالا مال
تھی یہی ثروت تری اور یہ ہی دولت تھی ندیم

ی یاد آئیں روز کہ تھا علم و ادب میں تیرا نام
یاد ایں دورے کہ ہے دل میں مکیں اب بھی ندیم

م
می کند واصفؔ چگونہ وصف و توصیفِ ندیم
در حقیقت قدرِ او دانند احبابِ قدیم

رنگِ تغزل

حمدِ باری

قابلِ شبہ نہیں ہے تری یکتائی بھی
طرفہ پھر یہ ہے کہ تو اُس پہ ہے ہرجائی بھی

سرنگوں پائی گئی شاہی بھی دارائی بھی
کام کچھ آ نہ سکی بینش و دانائی بھی

دل نے بخشی تری تصویر کو گویائی بھی
شوق نے کاٹ لی اپنی شبِ تنہائی بھی

تو بیاباں کو بھی گلزار بنا دیتا ہے
کیا قیامت ہے ترے حسن کی رعنائی بھی

یہ بتاتا ہے گلستاں میں تبسم غنچوں کا
حسنِ معصوم نے لی ہے کبھی انگڑائی بھی

کورِ باطن کے لئے ہیچ ہے جلوہ تیرا
اُس کی نظروں میں نہیں ہے تری زیبائی بھی

اُس کی درگاہ سے مایوس نہ ہو دل میں ندیم
اُس کی سرکار میں ہو گی تری شنوائی بھی

نعت شریف

سردارِ کائنات حبیبِ خدا ہیں آپ
سرتاجِ ممکنات و سرِ انبیاء ہیں آپ

لولاک کے سبب ہیں مدارِ بنا ہیں آپ
رازِ خدا کے محرمِ حق آشنا ہیں آپ

آئینہ دارِ حق ، سبب ماسوا ہیں آپ
برحق رسول از پئے ارض و سما ہیں آپ

سردارِ اتقیاء ہیں سرِ اصفیا ہیں آپ
گلزارِ کائنات کی بادِ صبا ہیں آپ

امت کی حشر میں بھی شفاعت کریں گے آپ
دنیا میں بھی ہر ایک کے مشکل کشا ہیں آپ

دُرِ درخشاں ، بحرِ رموزِ تجلیات
دنیا میں آخرت میں گرامی سما ہیں آپ

ہے آپ کے قدم سے ہی وابستہ لطفِ حق
اہلِ جہاں کے حق میں بڑی کیمیا ہیں آپ

سیراب فیضِ عام سے ہے آپ کے جہاں
بحرِ عطا و قلزمِ جود و سخا ہیں آپ

بخشش نہ تیری چاہیں گے کس طرح اے نلکیہ
ہاں بخشش دینے والے ہی جرم و خطا ہیں آپ

معرفتِ صفات

کوششیں تھک کے رہ گئیں معرفتِ صفات میں
دخل مگر نہ پا سکا کوئی بھی خاص ذات میں
راہِ طلب میں آدمی عزم کو مستقل رکھے
چاہیئے ڈگمگا نہ جائے آفت و مشکلات میں
قابو میں دل ہی جب نہیں کیا مزہ پھر حیات سے
یہ بھی ہے کائنات ایک، عالم کائنات میں
آپ ہیں سب پہ ملتفت مجھ کو اسی کا رنج ہے
وجہِ سکوں نہیں رہی آپ کے التفات میں
دل تو اسی طرح رہا رنج و الم میں مبتلا
کچھ بھی مزا نہیں ملا ان کے تعلقات میں
غیر کی کیا مجال ہے تیرے اشارے کے بغیر
کر سکے نکتہ چینی جو میری ہر ایک بات میں
موت سے اِس جہان میں بچ نہیں سکتی زندگی
موت لگی ہے ساتھ روز اسی کی گھات میں
پہلے ہی رنج کم نہ تھے دل کو ترے فراق میں
آفتیں اور بڑھ گئیں ہجر کی کالی رات میں

جبر اور اختیار میں جتنا بھی بُعد ہے ندیم
اتنا ہی فرق ہے عیاں زندگی و ممات میں

نظام ہستی

حجاب جلوہ بنا روئے سیم بر کے لئے
رہا نہ لطف ہی کچھ دیدۂ نظر کے لئے
نگاہِ ناز نے کچھ التفات ہی نہ کیا
وگرنہ جان تھی قربان عمر بھر کے لئے
شکار ہو کے رہا جس نے اک نظر دیکھا
بلائے جاں ہے ادا تیری ہر بشر کے لئے
خلوص شیوۂ احسن ہے شک نہیں اس میں
حقیقتاً یہی زیور ہے ہر بشر کے لئے
اساسِ اُنس پہ قائم نظامِ ہستی ہے
ہے بے بہا یہی دولت دلِ بشر کے لئے
نہ نکلے گا مرا ارمانِ قتل بھی اُن سے
ہے یارِ تیغ بھی مشکل وہاں کمر کے لئے
فغان و نالہ و فریاد و آہ و زاری میں
گداز و سوز بھی پیدا تو ہوا اثر کے لئے
جہاں میں ملتی اگر جان و دل کو کھو کر بھی
تو لاتے جنسِ وفا اپنے سیم بر کے لئے
چلی نہ پیش کسی کی ندیم قسمت سے
اگرچہ ہم نے مزے علم اور ہنر کے لئے

تمنائے قتل

پیوست دل میں تیرِ نظر چاہتا ہوں میں
خود اپنا امتحانِ جگر چاہتا ہوں میں

آئیں وہ خود بخود مرے گھر چاہتا ہوں میں
نالوں میں اپنے ایسا اثر چاہتا ہوں میں

بڑھ جائے کاش بیخودیِ شوق اس قدر
اصلا رہے نہ اپنی خبر چاہتا ہوں میں

ان کو ہو فکرِ چارہ گری اسے زہے نصیب
اچھا نہ ہو یہ زخمِ جگر چاہتا ہوں میں

ناقوسِ برہمن ہو کہ ہو شیخ کی اذاں
دونوں سے وا ہو ایک ہی در چاہتا ہوں میں

مدت سے پھر سے دل میں تمنائے قتل ہے
وہ آزمائے تیغ و تبر چاہتا ہوں میں

بے ساختہ سنائے کوئی مژدۂ نشاط
اس شامِ غم کی ایسی سحر چاہتا ہوں میں

محروم رکھے پیار سے، دل میں بسا کے بھی
اس سے تو رہنا اپنے ہی گھر چاہتا ہوں میں

یہ راہِ عشق، منزل آساں نہیں ندیم
بے راہبر پھر اس میں گزر چاہتا ہوں میں

سوزِ الم

آج جس کو مال اور دولت پہ اپنی ناز ہے
کل اسی کے واسطے خواری کا پھر آغاز ہے

تو ہے اہلِ مقدرت زیبا تجھے کب ناز ہے
تیری جانب سے مناسب عجز کا انداز ہے

حسن کے پردے میں جتنا بھی تجھے ناز ہے
تیرے روئے خوب کے پردے میں شرمِ باز ہے

جب تجھے عیبوں کی یوں پردہ دری مقصود ہے
ہر بنِ مو پھر بشر کے جسم میں غماز ہے

رنج غم، آفت، مصیبت ہی سے لطفِ عشق ہے
گر نہ ہو سوزِ الم تو پھر کیا ساز ہے

دیدنی ہے رنگ دل کا، کچھ اثر ہونے کے بعد
کس بلا کی پُر فسوں وہ شوخیِ انداز ہے

موت نے اس کے سکوں کا دائمی ذمہ لیا
جب یہ دیکھا حال عاشق کا ترے ناساز ہے

دل کی دنیا میں عجب ہنگامہ برپا کر دیا
کس بلا کا فتنہ ترا نازِ بتِ طناز ہے

تیرے اپنے باب میں کیا فکر تجھ کو ہو ندیم
رحمتِ باری ہی ہر دم گوش بر آواز ہے

کس مپرسی

بھلا عشق و ہوس کا فرق کب غافل سمجھتے ہیں
مقامِ حق و باطل صرف اہلِ دل سمجھتے ہیں

غضب کی کس مپرسی کا ترسے کوچہ میں عالم ہے
نمونۂ حشر کا ہم تو اسے قاتل سمجھتے ہیں

تعلق ہی نہیں اب آشیاں سے ہم اسیروں کو
قفس کی زندگی کو آخری منزل سمجھتے ہیں

ہیں جب عشق مشہود و شاہد ایک ہی راہِ حقیقت میں
تو مجنوں سے جدا کیوں لیلیِ محمل سمجھتے ہیں

گل و لالہ کا نظارہ وہ یوں گلشن میں کرتے ہیں
کہ ان کے رنگ کو خونِ دلِ بسمل سمجھتے ہیں

حصولِ جادۂ منزل ہی نصب العین ہو جن کا
وہ کب خوف و ہراس و خطرۂ منزل سمجھتے ہیں

جنہیں آسانیاں سارے زمانے کی میسر ہیں
بھلا وہ مشکلوں کو اپنی کب مشکل سمجھتے ہیں

غنی انسان ہے وہ بے نیازی جس کو حاصل ہے
نہ ہو یہ وصف جس میں ہم اسے سائل سمجھتے ہیں

جو خود کو دور کھینچے اور تماشہ ہو ندیم اس میں
اگر سلطان بھی ہو ہم اسے جاہل سمجھتے ہیں

امتحان کب تک

رہے گا سر پہ کوہِ رنج و غم اے آسماں کب تک
تہِ بارِ گراں جانِ حزین و ناتواں کب تک

ستاؤ گے جفاؤں سے ہمیں اے مہرباں کب تک
ہماری اس وفاداری کا لو گے امتحاں کب تک

فغان و آہ کے شعلوں سے مہرِ آسماں کب تک
نبھائے گی شبِ ہجراں میں جانِ ناتواں کب تک

تمہارے سوزِ غم نے جسم و جاں کو پھونک ڈالا ہے
رہے گی ایسی صورت میں بقائے جسم و جاں کب تک

یہاں تو ہر نفس اس زندگی کا ہو چلا دوبھر
گزارو گے جنابِ خضر عمرِ جاوداں کب تک

وہاں شوقِ حنا سے ان کو فرصت ہی نہیں ملتی
رہیں یہ چشم و مژگاں اپنے آخر خوں فشاں کب تک

ہم اپنے نامور اسلاف کی زندہ نشانی ہیں
رہے لیکن ہمارا دہر میں نام و نشاں کب تک

سراسر ابتیاں لپٹی ہوئی ہیں شاخِ سنبل سے
غضب ڈھائیں گی یہ ہاتھوں میں کالی چوڑیاں کب تک

ندیمِ خستہ کو کیوں غم دیئے جاتے ہو اس درجہ
رہے گی جسم میں اس کے بھلا تاب و تواں کب تک

جنبشِ مژگانِ یار

صانعِ قدرت کی صناعی نمایاں دیکھتے
اپنی صورت غور سے گر اہلِ عرفاں دیکھتے

اس طرف ہوتی اگر اک جنبشِ مژگانِ یار
سینکڑوں نشتر ہم اپنے دل میں پنہاں دیکھتے

دیکھنے وحشی کو اپنے تم خود آکر دشت میں
ہر طرف بکھرے ہوئے تارِ گریباں دیکھتے

سر بسر تصویرِ مایوسی نظر آتی تمھیں
تم اگر آکر مرا حالِ پریشاں دیکھتے

گر نہ کرتے ہمدم و ہمراز ہی ترکِ وطن
شہر کی آباد گلیاں ہم نہ ویراں دیکھتے

گر نہ ہوتی بخت میں گردش تو کب تم دوستو
مجھ کو کوئے یار میں پھرتا پریشاں دیکھتے

پھر نہ کرتے ہم شکایت گردشِ تقدیر کی
آنکھ سے ان کے اگر گیسوئے پیچاں دیکھتے

آپ دکھلا کر اسے راہِ مقامِ ہست و بود
کس طرح جاتی ہے یہ عمرِ گریزاں دیکھتے

کھنچ مرقد میں کفن جس طرح آتا ہے نظر
ہم یہی عالم شبِ مہتابِ ہجراں دیکھتے

پژمردگیٔ دل

کچھ اس نے علاجِ شبِ ہجراں نہیں دیکھا
جس نے کہ تمہارا حسنِ فروزاں نہیں دیکھا

آتے ہی تری بزم میں اے رونقِ محفل
پروانہ بسوے شمعِ شبستاں نہیں دیکھا

اُبھرے ہیں وہ سینے پہ گلِ داغِ محبت
ہم نے تو کبھی ایسا گلستاں نہیں دیکھا

پژمردگیٔ دل نے وہ تاثیر دکھائی
دنیا میں کہیں رنگِ بہاراں نہیں دیکھا

یہ سچ ہے ندیم اس میں ذرا فرق نہیں ہے
اک کیف سا استادِ غزل خواں نہیں دیکھا

———•✻•———

وہ پری وش خود جو ہو جاتا جنازے میں شریک
اپنے ہم تابوت کو تختِ سلیماں دیکھتے

جان دے دیتے خوشی سے ہم یقیناً اے ندیم
دستِ قاتل میں اگر شمشیرِ عریاں دیکھتے

ناصیہ فرسائی

کر کے اس بت سے محبت مجھے معلوم نہ تھا
ہو گی دنیا سے عداوت مجھے معلوم نہ تھا

فرقتِ یار میں اس طرح سے ہو گی نازل
جان پر میرے مصیبت مجھے معلوم نہ تھا

اہلِ دل ناصیہ فرسائی جہاں کرتے ہیں
ہے وہ درگاہِ محبت مجھے معلوم نہ تھا

ہستی کو راہِ مجازی میں مٹا دینا بھی
یہ بھی ہے رازِ حقیقت مجھے معلوم نہ تھا

اتنی ہو جائے گی یہ راہِ طلب بھی دشوار
آہ! یہ پیرِ طریقت مجھے معلوم نہ تھا

میں نے خوش ہونے کو چھیڑا تھا عدو کا قصہ
وہ سمجھ لے گا شکایت مجھے معلوم نہ تھا

درد محسوس ہی کرتا رہا میں دل میں ندیم
رہ گئی وصل کی حسرت مجھے معلوم نہ تھا

عتاب آگیں نظر

کہتی ہے اُن کی عتاب آگیں نظر میرے لئے
حوصلہ پیدا کریں قلب و جگر میرے لئے

روشنی دیکھی ہے یا آیا تجلّی کا سماں
ہے چراغِ طور گویا ہر شرر میرے لئے

چشمۂ حیواں پہ ہو تو خضر ہی کو ناز ہو
وہ سرابِ ہستی ہے سب بسر میرے لئے

وہ ہی وہ مجھ کو نظر آتے ہیں گھر میں ہر طرف
آئینہ خانے بنے ہیں بام و در میرے لئے

کیوں نہ منزل پہ پہنچنے کی امیدیں ہوں قوی
نقشِ پائے رہروان ہے راہبر میرے لئے

میں رہوں غافل جو تیری یاد سے اک دم ندیم
ہر نفس بارِ گراں ہو عمر بھر میرے لئے

حسنِ ازل

آئے ہو دنیا میں کیا خوشیاں منانے کے لئے
تم یہاں بھیجے گئے ہو غم اٹھانے کے لئے

جو ستم ایجاد کرتے ہو ستانے کے لئے
وہ نہیں شایاں وفا کے آزمانے کے لئے

عنبر کہتا ہے فقط قربان جانے کے لئے
چاہیئے دل جان کی بازی لگانے کے لئے

تیری چشمِ قہر ہے ظالم مٹانے کے لئے
اور چشمِ لطف ہے تیری جِلانے کے لئے

مقتضا حسنِ ازل کا تابِ مہر و ماہ ہے
گویا خود بیتاب ہے جلوہ دکھانے کے لئے

دل جگر چھلنی ہوئے تیرِ نگاہِ ناز سے
اب فقط اک جاں باقی ہے نشانے کیلئے

عنبر کو بھیجا عبادت کے لئے اس [illegible]
اک نرالا ڈھنگ ہے تیرے منانے کیلئے

بقائے کار

ہماری نظروں میں گر وہ سما گئے ہوتے
تو کائنات کو دل سے بھلا گئے ہوتے

اجل سے پہلے جو ہستی مٹا گئے ہوتے
تو ہم بھی رازِ حقیقت کو پا گئے ہوتے

مرے خیال کی دنیا میں آگئے ہوتے
تصورات کی دنیا بسا گئے ہوتے

بقائے کار کا ارمان ہی نہیں ہوتا
جہانِ فانی کا گر بھید پا گئے ہوتے

جبینِ شوق اگر جذبِ سنگِ در ہوتی
صلہ ہم اپنی عبادت کا پا گئے ہوتے

صفاتِ ذاتِ گرامی کو گر سمجھ لیتے
زمانے بھر پہ بہر طور چھا گئے ہوتے

فرشتے آتے تو عاشق کو اس جہاں میں ندیم
پیامِ خلدِ بریں کا سنا گئے ہوتے

ضبطِ غم

بہر منظر طبیعت رنج و غم ہر وقت پاتی ہے
فلک کو دیکھ کر بیداد تیری یاد آتی ہے

یہ ہیئت باغ کی طوفان کی صورت ڈراتی ہے
کہ شکلِ شاخِ گل اپنا نشیمن خود جلاتی ہے

اشارہ ایک کافی ہے مجھے گو چشمِ ہبگوں کا
نگہ کہتے ہوئے ساقی سے مجھ کو شرم آتی ہے

کھلے گا کس طرح سے غیر کے مکتوب کا مضموں
صبا کب اُن کے کوچے سے ہمارے پاس آتی ہے

ہر اک مشکل سے مشکل کام کر لینا تو آساں ہے
مگر آساں نہیں ہے ضبطِ غم یہ کس کی چھاتی ہے

خدا قائم رکھے گلگشت و سیرِ باغ کو ان کی
انھیں کے سامنے بلبل خوشی کے گیت گاتی ہے

مری تخریب بھی ہے موجبِ تعمیر گلشن میں
وہ سبزہ ہوں جسے سیرابی زہرابِ غم اگاتی ہے

زمانے کے حوادث کیا اثر انداز ہوں ان پر
طبیعت جن کی تیرا ناز تیرا غم اٹھاتی ہے

نہ خوفِ برق رہتا ہے نہ کچھ صیاد کا خطرہ
قفس کی قید ہی میں جان کچھ آرام پاتی ہے

ندیم اب بھی نہیں ہوتی ہے رنگیں داستاں تیری
اگرچہ کاوشِ دنیا تجھے بھی خوں رلاتی ہے

برق کا آشیاں نہ ہو جائے

ضبط اک دن فغاں نہ ہو جائے — وہ کہیں بدگماں نہ ہو جائے
اس قدر شادماں نہ ہو بلبل — موسم گل خزاں نہ ہو جائے
یہ مرے درد کی فراوانی — ہر نفس کی فغاں نہ ہو جائے
اے شبِ غم کراہنے والے — درد پنہاں عیاں نہ ہو جائے
زندگی میری عشق کے ہاتھوں — درد کی داستاں نہ ہو جائے
عشق کو کھیل جاننے والے — یہ کبھی جاں ستاں نہ ہو جائے
ہو امید وفا نہ تجھ سے اگر — زندگانی گراں نہ ہو جائے
جوشِ گریہ ارے معاذاللہ — آج دریا رواں نہ ہو جائے
مشکلیں میری کیوں کر آساں ہوں — تو اگر مہرباں نہ ہو جائے
جس کو دل میں چھپا کے رکھا ہے — وہ نظر سے عیاں نہ ہو جائے
دل میں ہر لمحہ درد رہنے سے — غم کہیں جاوداں نہ ہو جائے
اپنے عنوانِ پردہ داری سے — ایک دن تو عیاں نہ ہو جائے
موجزن جذبۂ عقیدت ہے — ہر گلی آستاں نہ ہو جائے
یہ تسلسل تری جفاؤں کا — کوئی بیزارِ جاں نہ ہو جائے
ہمیں کرنا ہے آشکار جسے — وہ کہیں خود عیاں نہ ہو جائے
میری ہستی ہے راز اندر راز — زندگی چیستاں نہ ہو جائے
تجھ کو اس وقت تک میں ڈھونڈوں گا — خوب جب تک عیاں نہ ہو جائے
یہ جو اب تک مرا نشیمن ہے — برق کا آشیاں نہ ہو جائے
بڑھتے بڑھتے یہ عشق کی گردش — گردشِ آسماں نہ ہو جائے

فصلِ گل کیا ہے اے ندیم اگر
جذبۂ دل جواں نہ ہو جائے

دامِ زلف

ہر اک اس بزم میں مسرور اور مستانہ آتا ہے
میسّر اب کسے مے کا وہاں پیمانہ آتا ہے

ترے جلووں نے بے خود کر دیا ہو جس کو دنیا میں
تو اس کی چشم میں کب خویش اور بیگانہ آتا ہے

اگرچہ کلکِ صنعت کے یہ سارے نقش یکساں ہیں
نظر کیوں کوئی فرزانہ کوئی دیوانہ آتا ہے

گزر اس بزم میں ممکن نہیں ہونا ہے جب ہم
تو اس حالت میں میرے کام یہ خم خانہ آتا ہے

کوئی غوطے لگائے لاکھ بھی گر بحرِ عرفاں میں
بلا امدادِ غیبی ہاتھ کب دُرِّ دانہ آتا ہے

محبت اُس بتِ کافر کی گر دل میں نہیں ہمبر
نظر کچھ دل سے یہ کیوں خواب میں بتخانہ آتا ہے

وہ خالِ رُخ وہ دامِ زلف اس کو آب و دانہ ہیں
ندیم اس مرغِ دل کی خبر لیتا یا نہ آتا ہے

مدارات

جہاں مل گئے اک نہ اک بات کر لی
اسی طرح ان سے ملاقات کر لی

خفا ہیں ملاتے نہیں آج نظریں
خدا جانے غیروں سے کیا بات کر لی

وہ خاطر میں اپنی نہ لائیں نہ لائیں
بہت ہم نے خاطر مدارات کر لی

سکوں ہوگا حاصل دلِ مضطرب کو
تصوّر میں ان سے اگر بات کر لی

فرشتوں سے بڑھ کر وہ انساں ہیں جس نے
غم و عیش میں بس مساوات کر لی

تعجب سے رہ رہ کے وہ پوچھتے ہیں
جدائی کی کیسے بسر رات کر لی

ندیم اپنی جادو بیانی سے آخر
بڑی ان سے گہری ملاقات کر لی

روزنِ ناسور — حشر ساماں

گرچہ ذاتِ کبریا وہم وگماں سے دور ہے
مظہرِ انوار لیکن سینۂ منصور ہے

کب ترا ابرِ مقابل کوئی مہر نور ہے
ماہ بھی اک خالِ رخسارِ شبِ دیجور ہے

جس گھڑی پیش نظر وہ نرگسِ مخمور ہے
اس گھڑی پانی کا قطرہ بادۂ انگور ہے

تیرے غم میں اس طرح سے دل مرے سینہ میں آب
جیسے مرجھایا ہوا اک دانۂ انگور ہے

خواہشوں کی الجھنوں سے یاس نے یوں دی نجات
جس طرح آسودہ خاطر رات میں مزدور ہے

غنچۂ عشرت سے عاری یوں دلِ رنجور ہے
اس کی قسمت میں ہمیشہ زخم کا انگور ہے

ترکِ لذت ہے یقیناً وجہِ ہر گونہ سکوں
محفلِ عشرت نہیں ہے خانۂ زنبور ہے

میں ہوں وہ بسمل کہ وقتِ ذبح جس کو دیکھ کر
دیدۂ حسرت سے گریاں جو ہر ساطور ہے

عشق کے پیکان سے سینہ مرا چھلنی ہوا
چشمِ افعی کی طرح ہر روزنِ ناسور ہے

زیرِ ابرو جو موئے مژگاں ہیں،
ہیں وہ نشتر کہ دل میں پیکاں ہیں

کل جو شکلیں تھیں انجمن افروز
آج وہ شمعیں زیرِ داماں ہیں

خاکِ مجنوں جہاں جہاں پہنچی
وہ زمینیں ہی سب بیاباں ہیں

قصۂ عشق را نہایت نیست
ساری باتیں یہ حشر ساماں ہیں

دم جو رکتا ہے الجھنوں سے ندیم
زلفیں شاید وہ پھر پریشاں ہیں

کیا بتاؤں کون ہے معمارِ قصرِ عشق کا
کوہکن تو ایک ادنیٰ گرسنہ مزدور ہے

کرتے ہیں دعویٰ انا الحق کا بیاباں ہر حباب
درحقیقت یاد کس کو قصۂ منصور ہے

زخمِ دل پیدا کرے پیکاں یہ ممکن ہے ندیم
زخمِ دل اچھا کرے پیکاں یہ اس کی دور ہے

ذوقِ دید

ہے شوقِ خاکروبی مجھے کوئے یار کا
آئے نہ آئے اس کو یقیں خاکسار کا

کیا حال پوچھتے ہو دلِ بے قرار کا
سینے میں میرے گوشہ ہے اک لالہ زار کا

اس کو ہے ذوقِ دید ترے جلوہ زار کا
یارب ہے تو حفیظ دلِ بے قرار کا

محرومیوں کے بعد بھی دل کو سکون ہے
ہر حال میں ہے شکر مرے کردگار کا

کرتی خدائی تجھ کو ادا سجدہ ہائے شوق
چھوتا جو سنگِ در مرے سنگِ مزار کا

رحمت سے پھر بھی ہٹ نہیں سکتی مری نظر
ہرچند معترف ہوں گناہِ کبار کا

کیوں اپنے راز سے کوئی واقف ہو دوسرا
اظہارِ غم ہے کام کوئی ہوشیار کا؟

گو آسماں پہ لاکھ نظر آئے آفتاب
گوشہ مری نگاہ میں ہے بامِ یار کا

درکار رازداریٔ غم کو ہے اے ندیم
دنیا میں آدمی ہی، جو ہے اعتبار کا

مئے آتشیں

جس کی بھی سنگِ در پہ تمہارے جبیں نہیں
اس نامراد کا تو ٹھکانہ کہیں نہیں،

انداز تیرے کس کے کہاں دل نشیں نہیں
عشوہ میں کچھ جواب ترا نازنیں نہیں

وحشت نے پیرہن سے سبکدوش کر دیا
اب غم نہیں کہ جیب نہیں آستیں نہیں

جنت میں کیا ملے گی شرابِ طہور بھی
دنیا میں جب نصیب مئے انگبیں نہیں

سن کر وہ چپ ہیں آرزوئے وصل اس طرح
ہاں کا تو ذکر کیا ہے زباں پر نہیں، نہیں

صورت کسی کی دل کی خریدار لاکھ ہے
پردہ مژہ کا وہ نگہہ سرمگیں نہیں

ہے دل ہمارا سرد، وہ گرمائے کس طرح
پینے کو جب نصیب مئے آتشیں نہیں

رونق ہے دل میں آرزوئے وصلِ یار سے
ویراں ہے وہ مکان کہ جس میں مکیں نہیں

دنیا کا کیوں نہ رہنے کا غم اے ندیم ہو
رہنے کا یہ مکاں یہ فلک یہ زمیں نہیں

لذتِ پرواز

کثرتِ غم میں بھی لب پر مرے فریاد نہیں
خوگرِ جور ہوں میں شاکیِ بیداد نہیں

دل سے مجبور ہوں شیوہ مرا فریاد نہیں
میرے نالوں میں اثر کیا ستم ایجاد نہیں

بجز گریہ کا سبب ہے مری آہوں کا اثر
خشک و تر میں کوئی اس واسطے دل شاد نہیں

مذہبِ عشق میں شکوہ تو ہے اک جزوِ لطیف
عشق کی جنس مگر نالۂ فریاد نہیں

عشوۂ و ناز و تبختر ہے شعار اس بت کا
خوگرِ ضبط ہیں ہم خوگرِ فریاد نہیں

گل نے دل خون کیا نالۂ بلبل سن کر
گلشنِ دہر میں غم سے کوئی آزاد نہیں

ساری محفل پہ ہیں الطاف و عنایات و کرم
اک فقط میرے لئے ہی کوئی ارشاد نہیں

عشق میں خوگرِ فریاد جہاں ہے لیکن
وردِ لب میرے مگر نالۂ و فریاد نہیں

زہے پروانگیٔ لذتِ پروازِ بلبلِ بے پر
گو قفس میں ہے مگر شکوۂ صیاد نہیں

غیرتِ شمشاد

جب کبھی اس بے وفا کو یاد کر لیتا ہوں میں
راحت و صبر و سکوں برباد کر لیتا ہوں میں

وصلِ جاناں ہو میسر یہ خیال و خواب ہے
بس تصور ہی سے دل کو شاد کر لیتا ہوں میں

جب کوئی سروِ سہی گزرے نظر کے سامنے
یاد تجھ کو غیرتِ شمشاد کر لیتا ہوں میں

بیٹھ جاتا ہوں کہیں تیرا تصور باندھ کر
رنج و غم سے خود کو یوں آزاد کر لیتا ہوں میں

تنگ کرتا ہے مجھے جب جرم و عصیاں کا خیال
تیری رحمت دیکھ کر دل شاد کر لیتا ہوں میں

یاد میں اس گل کی اکثر باغ میں تیری طرح
نغمہ سنجیِ بلبلِ ناشاد کر لیتا ہوں میں

کچھ نہیں کرتا قفس میں اور تو اس کے سوا
نالہ گاہے گاہے اے صیاد کر لیتا ہوں میں

مجھ سے تو ناراض رہتا ہے تو اس کا کیا کروں
ہر خوشی تیری ستم ایجاد کر لیتا ہوں میں

کھینچ لاتا ہوں انہیں اپنے تصور میں ندیم
دل کے ویرانے کو یوں آباد کر لیتا ہوں میں

جنونِ شوق

بنے جس سے مقدر کاش وہ تدبیر ہو جائے
نتیجہ ہر مری تدبیر کا تقدیر ہو جائے

وصالِ یار کی یارب کوئی تدبیر ہو جائے
کبھی یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر ہو جائے

جنونِ شوق ایسا ضعف دامنگیر ہو جائے
کہ ہو گردن میں طوق اور پاؤں میں زنجیر ہو جائے

یقینِ عشق کامل بے زبانی سے ہوا آخر
ہمیشہ یار اب ایسا نہ ہو توقیر ہو جائے

سزا کے بدلے رحم آجائے ان کو میری حالت پر
جنونِ شوق ایسی بھی کوئی تقصیر ہو جائے

بوقتِ صبح پیری خواب سے اٹھنا ہی بہتر ہے
کہیں توبہ و استغفار میں تاخیر ہو جائے

وہ مجھ کو دیکھتے ہیں ہر گھڑی دزدیدہ نظروں سے
انھیں کیا گر مرے پہلو میں زخمِ تیر ہو جائے

ترے ہونٹ گلِ گلشن میں کب ہے دلکشی ایسی
نہ کیوں جانِ گل و گلشن تری تصویر ہو جائے

نظر آجائے تیرا جلوہ گر اہلِ بصیرت ... کو
تو حیرت ان کی ان کو عالمِ تصویر ہو جائے

جو کھولے زلفِ پرخم اپنی کوئی وقتِ آرائش
دلِ دیوانہ، وہ تیرے لئے زنجیر ہو جائے

رہا کرتے ہیں سب سعی و عمل بے سود دنیا میں
نہ جب تک متفق تدبیر سے تقدیر ہو جائے

تمھیں بدنام کرنے کا فقط الزام ہے مجھ پر
بھلا مجھ سے یہ کب ممکن ہے یہ تقصیر ہو جائے

نہ جا تو سوئے بتخانہ کہیں ایسا نہ ہو زاہد
بتانِ بتخانہ کی تصویر دامنگیر ہو جائے

لبوں کی مسکراہٹ جب تمھاری دیکھ پائے
گل کیسے نہ کھل کر عالمِ تصویر ہو جائے

ندیم اس کے کرم [illegible] ہے [illegible] مغفرت ورنہ
عمل سے تیرے [illegible] یہ ہو جائے

منظومات

و

قصائد

رباعی

وہ جامِ خودی جو چھڑائے ، ہے اور
وہ کام جو ہر کام بنائے ، ہے اور
ہر چند رہِ دیر و حرم ، برحق ہیں
وہ راہ کہ خود جس میں تو آئے ، ہے اور

قطعہ

عشقِ لیلیٰ کا مزہ قیس سے پوچھے کوئی
لذتِ عشق کو ہر اہلِ ہوس کیا جانے
گُل کا رس پوس کے کمبخت یہ اُڑ جاتی ہے
سوز و سازِ دلِ پروانہ مگس کیا جانے

مشہور اسلامی تہوار

عید

ہوں کیوں نہ دل فریب یہ نقش و نگارِ عید
ہے جنتِ نعیم کی رو کش بہارِ عید

پیغامِ روح پرور و بہجت فزا نوید
لائی ہے باغِ دہر میں بادِ بہارِ عید

سہرا بندھا ہے تارِ گریباں کے بدلے آج
دیوانے کے بھی سر پہ طفیلِ بہارِ عید

لو روزہ دارو فضل و کرم کی نوید لو!
چمکا وہ آسماں پہ مہِ شاندارِ عید

ہے باعثِ سرور یہ دیں دار کے لئے
ایماں کے گل سے کھنچتا ہے عطرِ بہارِ عید

ایماں و دیں کے باغ میں آجائے گی بہار
بارش کرے گا فیض کی ابرِ بہارِ عید

ہے پھر بھی عید، عید مبارک ہو دوستو!
اگلا سا گو نہیں ہے وہ عزّ و وقارِ عید

استاد سے کہیں گے یہ ہم، اپنے اے نذیر
دائم مبارک آپ کو صولت بہارِ عید

مبارکباد

جشنِ شادیِ جگر بند مبارک باشد — خانہ آبادیِ فرزند مبارک باشد

ایک مدت سے تمنا تھی دلوں میں اس کی — بہجتِ عشرتِ دلبند مبارک باشد

شاہزادے کی عروسی کی خوشی ہے سب کو — لطف تا عرصۂ صد چند مبارک باشد

ہے بنا عالی نسب اور بنی والا نسب — عالی نسبوں کا یہ پیوند مبارک باشد

زینتِ جشن رہیں سارے ہی احبابِ عزیز — بزمِ اصحابِ فرزند مبارک باشد

ما بدولت [illegible] ہاتھوں میں گنگنا بندھنا — لذتِ راحتِ ہر بند مبارک باشد

شرفِ چشمِ من اجابت بدہ یا عبدِ مجیب

انفعالِ ہمیتِ سخنِ چند مبارک باشد

مبارکباد

بموقعۂ جشن سالگرہ

حضور انور نواب سعادت علی خاں بہادر، دام اقبالہ

شوکتِ جشنِ ملوکانہ مبارک باشد
عشرتِ شادئ شاہانہ مبارک باشد

آپ ہیں وارثِ نواب امیر الدولہ
جلسۂ عیشِ امیرانہ مبارک باشد

آپ ہیں سارے ہی اوصاف وزیر الدولہ
خسروا شانِ وزیرانہ مبارک باشد

دادا صاحب کا لقب تھا جو یمین الدولہ
خصلتِ یمنِ بزرگانہ مبارک باشد

حضرت والدِ مرحوم امین الدولہ
جاہ واعزازِ شریفانہ مبارک باشد

دل و جاں سے ہیں عزیز آپ عزیز الدولہ
نسبتِ شانِ عزیزانہ مبارک باشد

ہر برس آپ کی ہوتی ہی رہے سالگرہ
جشنِ آرائشِ شاہانہ مبارک باشد

شیر افگن ہو مبارک ہنرِ شیر شکار
جرأت و ہمتِ مردانہ مبارک باشد

دائما باش بامید و مراد و مقصد
خواہشِ من چو مریدانہ مبارک باشد

اس ندیم تیرے نمک خوار کو تیرے در سے
نسبتِ فخرِ ندیمانہ مبارک باشد

قصیدہ

بموقعہ مسند نشینی

ہز ہائینس نواب محمد فاروق علی خاں صاحب بہادر

والئ ریاست ٹونک

ہلالِ عید کو حاصل ہوا شرف جو کمال — وہ تیری تخت نشینی سے ہے شہا امسال

اگرچہ عیدیں ہزاروں ہی آئیں دنیا میں — مگر وہ بات کہاں جس سے ہو ہر اک خوشحال

ہے اس ہی عید سے تمہیدِ جشنِ سالگرہ — کہ جس کا حال میں کرتا ہوں درج بالاجمال

قلعۂ معلیٰ میں اس عید کی خوشی میں بھی — لگایا جاتا ہے دربارِ شوکتِ اجلال

اور اس مکان کو دیوان خانہ کہتے ہیں — جہاں پہ ہوتا ہے یہ جلوۂ ظہورِ جمال

بچھی ہے صدر میں اس کے یہ مسندِ زریں — کہ چرخ کو بھی میسر نہیں ہے یہ اجلال

حضور اپنے محلات سے وہاں آکر — جلوس کرتے ہیں باصد شکوہ و عز و جلال

ہیں خاندانِ ریاست کے سب امیر و کبیر — نشست گاہ میں بیٹھے ہیں وہ قرینِ خصال

وزیرِ تعلیم و دیگر وزیر با تمکیں — حضور بیٹھے ہیں دل شاد اور فارغ بال

مشیرِ خاص بہادر ہیں قربِ مسند میں — کہ جن پہ چشمِ عنایت حضور کی ہے کمال

کھڑے ہیں پاس ہی اہلِ قرینہ و بخشی — کسی کے ہاتھ میں ہے مورچھل کہیں رومال

اہالیانِ دفاتر و افسرانِ فوج — کھڑے ہوئے ہیں سبھی باادب یمین و شمال

ہیں ایک سمت میں بیٹھے حکیم اور شاعر — نجومی، پنڈت و عطّار، وید اور رمّال

نقیب اپنے قرینے سے بولتا ہے کھڑا — وہ چوبدار لئے ہاتھ میں ہے چھڑیاں لال

ہر اک کا ہوتا ہے آداب گاہ سے مُجرا — بہ پیشِ حاکمِ باعدل و صاحبِ اقبال

گزارتے ہیں یہاں اپنی نذریں سب — قبول کرتے ہیں سرکار بانشاطِ کمال

قلعے کے برجوں سے توپیں سلام کرتی ہیں — کہیں چلے ہے شترنال اور کہیں گھڑنال

پٹھان، تیغ زن و راجپوت پُر دل سب — ہوئے ہیں مجرے کو، حاضر لگا کے تیغ و ڈھال

شرع شریف کے ناظم و مفتیانِ کرام — ہیں آئے دینے دعا تاکہ ہو بلند اقبال

اسی طرح سے غلامی کو شہ کی حاضر ہیں — کہاں تلک کروں ہر ایک کا بیں ذکرِ کمال

ندیم تیرا نمک خوار لے کے آیا ہے
قصیدہ مدح میں تیری شہ ستودہ خصال

رکھے ہمیشہ صلاح و فلاح سے تجھکو
ترا محافظ و نگراں خدائے ذوالجلال

قصیدۂ تہنیت

کتخدائی دخترِ نیک اختر شری مان دیوی شنکر جی تیواڑی

چیرمین پبلک سروس کمیشن گورنمنٹ

راجستھان ٹونک

واہ وا ہے آج کیسی دھوم دھام — ہر طرف ہے طمطراق و اہتمام
گوش کیا نغموں سے لذّت گیر ہیں — خوشبوؤں سے عطر آگیں ہیں مشام
کوچہ و بازار آئیں بند ہیں — ہیں در و دیوار پُر رونق تمام
ہر طرف پھاٹک بنے ہیں جا بجا — خیر مقدم سے مزیّن ہیں تمام
جشنِ جمشیدی نہ کیوں آئے نظر — اہلِ دانش نے کیا ہے انتظام
ولولے، خوشیاں، اُمنگیں جوش پر — لطفِ عشرت کیا یہ لایا ہے پیام
اس قدر مسرور ہے ہر اک بشر — گویا حاصل ہے مئے عشرت کا جام
شب کو برقی قمقموں کے نور سے — ہو گئے روشن سراسر کوئے و بام
میں نے پوچھا ایک سے کیا جشن ہے — گر مجھے واقف تو اس سے نیک نام
ہو کے حیراں مجھ سے وہ کہنے لگا — تو کہاں رہتا ہے تیرا کیا ہے نام
دخترِ دلبند کی شادی ہے آج — ان کی جن کو چاہتے ہیں خاص و عام
وہ [illegible] ہیں راجستھان کے — صاحبِ اوصافِ مقبولِ [illegible] انام
جو ہیں زیبِ مسندِ علم و ہنر — ہیں وہ بے شک قابلِ صد احترام
ہند کے جن کے در کے اقبال و حشم — طالعِ بیدار ہے ان کا غلام

افتخارِ افسرانِ ذی حشم — مدح مجھ سے ان کی ہو کیوں کر تمام

نفع پبلک کا انھیں منظور ہے — ہمتِ والا ہے صرفِ انتظام

ان کی عقلِ دادرس کے سامنے — کان پکڑے خود فلاطوں لا کلام

ان کو دنیا کے قواعد یاد ہیں، — صاحبِ انصاف ہیں وہ لا کلام

ظلم ان کے ہاتھ سے ہونا محال — اس لئے سونپی ہے گیتی نے زمام

ان کے اخلاقِ حمیدہ کی شمیم، — کرتی ہے عالم کا عطر آگیں مشام

ہیں وہ قابل اور عادل ہر طرح — ہے صدارت ان کی پُر از احتشام

بہرِ تحصیلِ مطالب روز و شب — خلق کا ہے ان کے در پر اژدحام

آستانے پر جو ان کے آگیا — پھر نہیں رہتا وہ بے نیلِ مرام

یہ تو ان کی ذات میں ہیں خوبیاں — دیوی شنکر جی تیواڑی ان کا نام

ہے انھیں سے خانداں میں روشنی — ہیں گھرانے بھر میں وہ ماہِ تمام

صدر ہیں بی۔ ایس۔ سی جے پور کے — بخشا راجستھان نے ایسا احتشام

رائے صاحب کے سپوتِ کامگار — بھائی بھی ان کے پرنسپل ذی مقام

ہیں پروفیسر برادر دوسرے — خلق میں مشہور ہے ان کا بھی نام

ان کے ہو علم و ہنر کا وصف کیا — آفتاب القصہ ایں خانہ تمام

ان کی دختر کی رچی شادی ہے آج — ہے اسی کے واسطے یہ اہتمام

سنتے ہی میں یہ نویدِ جاں فزا — ہو گیا مسرور بے حد لا کلام

شعر تہنیت کے یہ میں نے لکھے — کر لیا شاہی قصیدے کا نظام

کیوں کہ سارے کام شاہانہ سے ہیں
چاہیئے مجھ کو بھی یہ ہی احترام

چاہیئے دل سے دعا دینی مجھے
وصف و مدحت سے نہیں چلتا ہے کام

کام آتی ہے دعا انسان کے
ہے دعا کا عرش اعلیٰ پر مقام

اے خدا رکھ ا دلہن و دولھا کو خوش
بال بھی بیکا نہ ہو ان کا مدام

پھلیں پھولیں ہمیشہ خوش رہیں
اور دنیا میں رہیں یہ شاد کام

اپنی دادی کی طرح دلہن رہیں
باسہاگ و با مقدّر شاد کام

بال بچوں سے پھلی پھولی رہیں
باغ میں آئیں بہاروں کے پیام

وہ بھی اور ان کی جننی خرّم رہے
سر پہ ہو ماں باپ کا سایہ مدام

چھوڑ کر ممدوح کی مدحت سلیم
اب دعا پر ختم کر اپنا کلام

راحتِ دل ہو انھیں دائم نصیب
خوابِ راحت دشمنوں پر ہو حرام

اب میں دیتا ہوں دعا ممدوح کو
عزّتوں سے ہو جہاں میں ان کو کام

دشمنوں کو ان کے ہو رنج و ملال
دوستوں کو ان کے ہو عشرت مدام

اے خداوندِ زمین و آسماں
رکھ جہاں میں ان کی تو عزّت مدام

قصیدہ

در تہنیت عالی جناب ڈاکٹر شری گنیش سکھا رام صاحب

یونیورسٹی آف راجپوتانہ ۔ راجستھان

واہ کیا ملکوں کا سرتاج ہے یہ اپنا ملک
کیسی رونق ہے یہاں کیسی فضا کیسی پھبن

اس کی زرخیزی و گل ریزی جہاں میں مشہور
معدنِ لعل و گہر اس کے سبھی دشت و دمن

پوچھنا کیا ہے بھلا آب و ہوا کا اس کی
ملک کشمیر ہوا تبدیل نہ باغ و گلشن،

تین جانب سے سمندر نے اسے گھیرا ہے
ساحلِ شہر نہ کیوں اس کے بنیں رشکِ عدن

غیر ملکوں سے تجارت کا نتیجہ یہ ہوا
سارے ناداروں نے زر سے بھرے اپنے دامن

اس کے بازاروں کی رونق کا عجب عالم ہے
زیب و زینت میں ہے ہر ایک دکاں جیسے دلہن

کان میسور میں سونے کی ہے یہ سنتے ہیں،
کیوں نہ ہو نام دکن اس سے جہاں میں روشن

یہ وہ خطہ ہے جہاں اہل خرد ہوتے ہیں
یہ وہ خطہ ہے نہیں ہوتے یہاں پر کودن

پائے جاتے ہیں یہاں چار طرف اہلِ ہنر
دیکھے جاتے ہیں یہاں چار طرف صاحبِ فن

شنکر آچاریہ اسی دیش میں ہی پیدا ہوئے
گو کھلے کا بھی رہا ہے یہی مالوف وطن

چاند بی بی نے یہاں دادِ شجاعت دی ہے
اور حیدر بھی رہا یاں پہ بزورِ آہن

راجہ شیواجی جو تھے تیغ و علم کے مالک
راج گوپال آچاری بھی ہیں ذی فہم و فطن

الغرض ہند میں یہ خطہ نہیں رکھتا جواب ہوتے آئے ہیں اسی خاک سے سب ماہرِ فن

آج بھی ہیں یہ شہری بھی انھی کے مہاجنی ودوان ماہرِ علم و ہنر، تاجِ سرِ ملکِ دکن

آپ ہی ذاتِ گرامی کا بیاں کیا کیجیے آپ بھارت کے لئے ناز ہیں اے جانِ دکن

بچپنے ہی سے تھے آثار نمایاں سب کچھ تھا لڑکپن ہی سے قسمت کا ستارہ روشن

اپنے ہم چشموں میں ہر وقت رہے تم ممتاز سارے استادوں نے مانا تمھیں خود نیک چلن

اپنی تیزیٔ ذہانت کی بدولت تم نے لب سے لب سی دیئے جس دم ہوئے سرگرمِ سخن

غیر ملکوں میں بھی اس طرح بٹھایا سکہ رہ گئے دنگ تمھیں دیکھ کے اہلِ لندن

جنم ہی تم نے لیا علم کی خدمت کے لئے علم نے پایا ہے سینے میں تمھارے مامن

ہر فلاطونِ جہاں اور ارسطوئے زماں پیشوا تم کو سمجھتے ہیں سبھی صاحبِ فن

آپ کے علمی تبحر کی وہ ہیبت ہے جناب آپ کے سامنے ہر شخص جھکائے گردن

مدحِ حاضر ہیں پڑھوں اور بھی مطلع رنگیں جس میں ممدوح کے ہی ساتھ چلے مدحِ دکن

مطلعِ ثانی

کیوں زمانے میں اجالا نہ کرے ملکِ دکن کہ جہاں علم و ہنر کے ہیں ستارے روشن

فیض اس ملک کا اکسیر عبارت کے لئے خاک اس ملک کی کر دیتی ہے تانبہ کندن

اس قدر لعل و گہر ہند نے پائے اس سے کہ بنا جن کی بدولت یہ بدخشان و یمن

کوہِ نور ایک جو ہیرا ہے وہ مشہورِ جہاں ارمغاں وہ بھی ہے اک پیشکشِ ملکِ دکن

لاکھ ہیروں سے جدا ہے مرے ممدوح کی ذات آپ کی ذاتِ گرامی سے ہیں ہیرے روشن

فرد ہیں اپنی جگہ آپ وہ دُر دانہ ہیں آپ کا ثانی نہیں آپ ہیں یکتائے زمن ،

راجپوتانہ کی تاباں ہوئی یونیورسٹی — فیض سب پر آئی، ہوا نام جہاں میں روشن

اس کی عظمت کو بہت جلد بڑھایا تم نے — نام آدر ہوئی یہ، اس میں نہیں جائے سخن

سادگی، عجز اور ادراک سمجھ، علم و ہنر — اتنے جوہر ہیں بہم آپ میں اے فخرِ زمن

رتبہ میں سب سے بڑے عزت و حرمت میں بڑے — اس پہ پھر سادہ لباس آپکے یہ زیبِ بدن

آپ کے علم کا پرتو ہے کہ نورِ مہتاب — آپ کے خُلق کی خوشبو ہے کہ خوشبوئے چمن

ایسے محُسن کا جدا ہونا گوارا کیوں ہو — جس کے احساں سے خمیدہ ہے ہماری گردن

اب خوشی یہ ہے۔ کہ بس دہلی یونیورسٹی — آپ کے آنے سے ہو جائے جہاں میں روشن

تاکہ اس فیض سے خالی نہ رہے کوئی جگہ — دولتِ علم سے بھر جائے ہر اک کا دامن

الغرض آپ کی تعریف ہے دشوار بہت — آپ کے وصف میں کیا ہو مجھے یارائے سخن

اے قدیمی اب یہ مناسب ہے کہ تم بہرِ دعا — ہاتھ اٹھا کر یہ کرو عرض کہ اے ربِ زمن

یوں گنیش سکھا کے ہو جائیں مددگار گنیش — کہ موافق رہیں تا دیر یہ اوقاتِ زمن

اس طرح پھولے پھلے آپ کا گلزارِ مراد — جس طرح باغ میں پھولیں گل و نسرین و سمن

شاداں آپ بھی دنیا میں رہیں حسبِ مُراد
جب تلک آکاش پہ ہیں چاند ستارے روشن

قصیدہ

بموقع اوپننگ سریمنی سعادت ہاسپٹل ٹونک لکھا گیا

زہے سعادتِ آوانِ دہر ذی تدبیر
خہے ترقّیٔ دورِ معیشت و تعمیر

زہے تمدّنِ کسبِ کمالِ عالمگیر
خہے تقدّمِ سائنس و عالمِ تدبیر

یہ وہ زمانہ ہے جس میں ترقیاں ہیں عیاں
یہ وہ زمانہ ہے اوّل بھی جس میں ہو آخیر

یہ وہ زمانہ مبشّر ہیں جس میں گل بے خار
اگر ہے خار تو وہ بھی ہے ایک گل کی نظیر

ترقیوں کا جو عالم ہے ٹونک میں ایسا
یہ ساری ایک نئی روشنی کی ہے تاثیر

یہاں کی صبح کے عالم کا پوچھنا کیا ہے
یہاں کی شام بھی صبح ا[illegible] بعدلِ شہیر

بعدلِ حاکمِ دوراں رئیس، والیٔ ٹونک
بہ دادِ حاکمِ ذی علم و ذی شعور و خبیر

شہے کریم و جواں بخت و عالی ہمّت
شہے بہ جود و سخا خسروے برائے منیر

وہ اپنی شان میں ممتاز ہے زمانے سے
جسے ملا ہے لقب جی سی آئی ای کا خطیر

ہے جس کی عام نظر اپنی ہر رعایا پہ
برابر اس کی نظر میں ہیں سب امیر و فقیر

بنایا جس نے شفاخانہ یادگار اپنا
اٹھائیں فائدہ جس سے ہر اک صغیر و کبیر

عمارت اس کی وسیع اور نئی ڈیزائن ہے
ہر اک دوا میں مسیحا کے دم کی ہے تاثیر

بھارت

پیارے بھارت مرے جیون کا سہارا تو ہے　　دل کا آرام ہے تو آنکھوں کا تارا تو ہے
ساری جنتا کے لئے جان سے پیارا تو ہے　　تو دل افروز، دلآرام، دلآرا تو ہے
تجھ پہ مرنے کے لئے شوق سے تیار ہیں سب
تیری عزت کے لئے بر سرِ پیکار ہیں سب

اپنے پوتوں کے لئے تو ہے وفا کی تصویر　　روشنی تجھ سے ہے سب تو ہے سراپا تنویر
دردمندوں کے لئے تو ہے دوا کی تاثیر　　دل نشیں خوابوں کی ایک تو ہی سنہری تعبیر
نقش ہر دل میں ہے یہ موہنی صورت تیری
پاک دنیا کے شوالے میں ہے مورت تیری

برہمن، شیخ، سبھی بندۂ احساں تیرے　　کوئی ہو سب کے لئے فیض ہیں یکساں تیرے
جینی تیرے، ترے سکھ ہندو مسلماں تیرے　　زندگی کے لئے محتاج سب انساں تیرے
تیری سیوا سے کہیں ہم نے کبھی منہ پھیرا
جسم ہیں جان رگوں میں یہ لہو ہے تیرا

ہند، والے سبھی کرنے کو ہیں جاں تجھ پہ نثار　　تیری صورت کو ترستے ہی رہیں گے اغیار
پیر ہو یا ہو جواں سب بخوشی ہیں تیار　　دیکھنا ان کے لہو اور پسینے کی بہار
آبرو قوم کی ہے تیری نگہبانی پر
میل آنے نہیں دیں گے تری پیشانی پر

چین والوں نے جو کی ہند سے یہ غدّاری　　پھر تو ہر اک پہ ہوئی غصّہ کی حالت طاری
کرکری آبرو وہم کر دیں گے اس کی ساری　　زندگی اب ہمیں ایک ایک گھڑی ہے بھاری
ہر طرح ہم کو ہے درکار ترقّی تیری
آنکھ سے دیکھیں گے سو بار ترقّی تیری

اس نے دیکھے ہیں کہاں ہند کے کس بل والے　　جنگ جو ہیں یہ ہر اک وقت میں ہلچل والے
شہر میں رہتے ہیں گو شیر ہیں جنگل والے　　جان کو اس کی ہیں سب رعد ہیں بادل والے
چین کے دھوکے کی ٹٹی کو ہٹا ڈالیں گے
نام بے دین کا دنیا سے مٹا ڈالیں گے

دیش پر اپنے کرے جو کوئی یلغار غنیم　　بارے دکھلائیں اُسے جوہر تیغ و دو نیم
ایک مدّت سے کئے بیٹھے ہیں یہ عزم صمیم　　دیکھ سکتا نہیں دشمن کبھی اس سمت ندیم
جان سے مال سے ہر طور سے تیار ہیں ہم
بسکہ لڑنے کو لئے ہاتھ میں تلوار ہیں ہم

یومِ جمہوریت

عیش و دل بستگی کے ساماں ہیں — جشنِ جمہوریت کی خوشیاں ہیں

شادمانی ہے آج ملک میں عام — ہند والے تمام شاداں ہیں

آج جمہوریت کے سورج سے — ملک کے سارے ذرّے تاباں ہیں

برقِ جمہوریت کی تابش سے — یاس کے چہرے آج خنداں ہیں

ڈھل گیا ظلم و جور کا سورج — اب ستارے بھی ماہِ تاباں ہیں

جشنِ جمہوریت کے مژدے سے — شادکامی کے جلوے رقصاں ہیں

ہندیوں کو حقوق ملنے سے — اہلِ معنیٰ ہیں اب وہ انساں ہیں

گلشنِ ہند رشکِ جنت ہے — جس میں آباد صد گلستاں ہیں

گنگا جمنا کے پانی کی گھونٹیں، — اب تاثّر میں آبِ حیواں ہیں

ہند کے دیکھ کر تدبّر کو — سب مدبّر جہاں کے حیراں ہیں

باہمی ربط و ضبط سے یک دل — ہندو عیسائی و مسلماں ہیں

ہند کی عقل و رائے یورپ پر — برتری رکھنے میں نمایاں ہیں

عقلِ یوناں سیاستِ افرنگ — رشک سے تار تار داماں ہیں

دیکھ کر عقل و رائے نہرو کی — دل رقیبوں کے آج لرزاں ہیں

حکمتیں لیڈروں کی گویا عطر — جس کے اجزاء تمام فرماں ہیں

ملک داروں میں لیڈر و حاکم — چندر گپت و فرید افغاں ہیں

شاد و آباد ملک کو پاکر — دل میں صد ہا خوشی کے ساماں ہیں

اس لئے یہ دعا دے تو بھی ندیم
ہوں ہمیشہ جو آج خوشیاں ہیں

زراعت کی ترغیب

قطعہ

کیا خوب یہ کل زیرک و دانا نے کہا
اور اس کے بجا ہونے میں شک ہو بھی تو کیا
کیا تاجر و پیشہ ور و حاکم سارے
اک خرمنِ دہقان کے ہیں زلّہ ربا

زراعت ہے ہندوستاں کی جاں — اسی سے تو زندہ ہے ہندوستاں
ہیں اس کے سوا اور جتنے بھی کام — اسی پیڑ کی ہیں وہ شاخیں تمام
اسی کی ہے برکت تمام و کمال — یہی ہے جو سچ پوچھو کسبِ حلال
اسی سے ہے جنّت یہ ہندوستاں — ہری کھیتیاں رشکِ صد بوستاں
اسی نے دیئے ہند کو سیم و زر — اسی نے بھرے دامنوں میں گہر
کہ اگلے زمانے میں اس کے طفیل — تھی اجناس کی کس قدر ریل پیل
مگر اب وہ اگلا سا کب رنگ ہے — زمانے کا کچھ اور ہی ڈھنگ ہے
جسے دیکھو پابندِ فکرِ معاش — پھرے دربدر رزق کرنا تلاش

نہ چہروں پہ رونق نہ کچھ دل میں جوش
نہ شدھ جسم کی ہے نہ کچھ جاں کا ہوش

گرانیٔ اشیاء سے اب آ کے تنگ
بھلے مانس اب کرتے پھرتے ہیں جنگ

مگر اے کسانو! - ذرا لو خبر
اٹھو اور ہمت سے باندھو کمر

زراعت کو اپناؤ - کھیتی کرو
تم اب کام کچھ جاں فشانی سے لو

درختِ حکومت کی ہو بیخ - تم
ریاست کے خیمے کی ہو میخ تم

تمھیں ہو مدارِ نظامِ جدید
تمھیں سے ہے آسان کارِ شدید

تمھاری جہاں بھی ہے داد و شنید
بجا ہے یہی ہے وہ عیدِ سعید

یہ جمہوری عہد اور یہ عہدِ نشاط
یہ پردھان منتری یہ ساری بساط

خدا اس کو تا دیر قائم رکھے
یہی عزّ و شان اس کی دائم رکھے

کہ دہقان گرمِ زراعت رہیں
ترقّی کریں با فراغت رہیں

وہ رقبہ کو جو ہیں زمینیں اٹھائیں
ہوں خود مستفید اور حاصل کمائیں

اگر لیں سبھی اس کا بیڑا اٹھا
تو دیں گے نحوست کو اک دم بھگا

یہ عسرت بدل جائے گی عیش سے
فنا ہوگا افلاس اس دیش سے

وہ آئیں گی پچھلی سی ارزانیاں
دلوں کو بھی ہوں گی وہ آزادیاں

وہ قولِ بزرگاں ترانہ قدیم
پھر آجائے گا اس پہ صادق قدیم

جو ہے روئے دنیا پہ جنت کہیں
یہی ہے یہی جس کا ثانی نہیں

اب ہم ہندی بولیں گے

بھائی ہے ہم کو کیسی ہندی　　سب کی زباں پر چڑھ گئی ہندی
زور کچھ ایسا پا گئی ہندی　　چاروں طرف ہے ہندی ہندی
اب ہم ہندی بولیں گے
دل سے اسی کے ہو لیں گے

پورے بنیں گے ہندوستانی　　ہے اس دیش کی ہندی بانی
بالکل ہم نے من میں ٹھانی　　اس میں نہیں کچھ آنا کانی
اب ہم ہندی بولیں گے
دل کی گھنڈی کھولیں گے

انگریزی کو چھوڑیں گے　　اس سے رشتہ توڑیں گے
اس سے منہ اب موڑیں گے　　اس کے نہ پیچھے دوڑیں گے
اپنی اسی رفتار کو لیں گے
دل کی گھنڈی کھولیں گے

ہندوستاں میں رہنے والو!　　آنکھیں کھولو! دیکھو بھالو
اس کا تم اب بیڑا اٹھالو　　دل سے ہندی کو اپنا لو
اپنی زباں یوں کھولیں گے
اب ہم ہندی بولیں گے

کیا ہی اس کے بول ہیں پیارے | مصری کی ڈلیاں ہیں سارے
دل پر قابو کرتے سارے | جی کو للچاتے ہیں ہمارے

موتی ہیں یہ، رولیں گے
اب ہم ہندی بولیں گے

آؤ سنو یہ بات ہماری | ایک نگر لاکھوں پر بھاری
ہندی سب لوگوں کی دُلہاری | ہے یہ حکومت کو بھی پیاری

اس کے دفتر کھولیں گے
اب ہم ہندی بولیں گے

دل سے نِدیمرکی ہے اچھا | پھیلے ہر جا اس کا چرچا
اس کا بنے ملجاو ماوا | ہندوستاں یہ دیش ہمارا

جے بھی اسی کی بولیں گے
اب ہم ہندی بولیں گے

بقیہ:- اختر اور اس کی شاعری - صفہ ۹۶ سے آگے

محبت کے لئے آباہوں میں دنیا کی محفل میں | محبت خون بن کر لہلہاتی ہے مرے دل میں
محبت ابتدا میری محبت انتہا میری | محبت سی عبارت ہے بقا میری فنا میری
محبت آرزو میری محبت جستجو میری | محبت خامشی میری محبت گفتگو میری

اختر کے اشعار کی شعریت، معنویت، سادگی، پُرکاری، قوتِ بیانی، روشن اور زندہ معنوری، اور عشق، زندگی کی جان ہیں۔ سارے الفاظ سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ صداقت ایسی کہ وہی لکھا ہے جو محسوس کیا ہے۔ زبان صاف اور شستہ، الفاظ سلیس اور روزمرّہ، زورِ طبع، جولانیٔ فطرت اور شاعری کا بھرپور آہنگ اس شعر میں کس قدر ہے۔ ؎

شعلۂ درد کو آنکھوں میں چھپا رکھا ہے
قلزمِ اشک کو آنکھوں میں چھپا رکھا ہے۔

ماسٹر رام نواس ـــــ ندیم

اختر اور اس کی شاعری

حضرت محمد داؤد خاں شیرانی، نام - اختر تخلص - متوطن "ٹونک" اپنے عہد کے ایک رومانی شاعر ہیں - اور ناظم بھی - انھوں نے شاعری میں نیا موڑ اپنایا - ان کا رنگ خاص ہے فرسودہ راستے اور عام روش سے علیحدہ - مصنوعی رنگ کو چھوڑ کر فطرت کی رنگا رنگیوں میں ڈوب گئے ہیں انھیں ایک طرزِ نو کا موجد کہا جائے تو بیجا نہیں - اور یہی ان کا انفرادی رنگ ہے بقول شخصے :- ؎

دل، رسم کے سانچے میں نہ ڈھالا تم نے اسلوبِ سخن، نیا نکالا تم نے،

فارسی میں امرد پرستی رائج ہے جس میں مرد ایک معشوق ہے - اس لئے جابجا مذکر ضمیریں استعمال ہوتی ہیں - مگر اختر نے ایک عورت کو "ڈائریکٹ" خطاب کیا ہے اس سلسلے میں اس نے ہندی شاعری سے زیادہ اثر لیا ہے - جہاں عورت ہی محبوبہ ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہی ایک نیچرل شاعری ہے - جو ملکی مزاج کے بھی عین مطابق ہے -

ملک میں انگریزی تعلیم نے قدیم رجحانات بدلے اور سماجی زندگی میں بھی تبدیلیاں پیدا کیں جن سے تصوّرات بھی بدل گئے اور ایک نئی دنیا سامنے آئی - جو نئے مسائل سامنے لائی - برسوں سے ادب کا سمندر ٹھہرا ہوا تھا اس میں بھونچال آگیا - ذہن میں وسعت اور کشادگی پیدا ہوئی - مغربی شعراء مثلاً ورڈس ورتھ، اور کیٹس وغیرہ کی نظموں نے یہاں کے شاعروں کی آنکھیں کھول دیں - ایک جرمن فلسفی گیٹے کا قول ہے - کہ :-

"درد و محبّت کے جذبات دنیا کی ہر ایک شئے میں موجود ہیں - اور عورت، جذبات کا ایک جیتا جاگتا مجسمہ ہے ـــ"

چنانچہ اختر شیرانی نے اس کو بہت قریب سے دیکھا اور اس عشق و محبّت کے ماحول کو جس میں ہر شخص اپنی زندگی میں سانس لیتا ہے اپنی اعجاز بیانی سے ایک غیر معمولی طریقے سے زندۂ جاوید بنا کر رکھ دیا -

اختر شیرانی کو، برسوں زندگی اور عشق کے ہاتھوں مٹ کر یہ اندازِ نظم گوئی حاصل ہوا ہے۔ وہ دل کی آگ میں مدّتوں گداز ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی نظمیں سب کے دلوں میں گھر کر چکی ہیں۔ اور ان میں تاثرات قلب اور واردات عشق کا بیان ہے اسی لئے لوگ سوز و گداز پر سر دھنتے ہیں۔ اور بس جگر تھام کر ہی رہ جاتے ہیں۔

رسمی شاعری میں یہ کیفیات کہاں پیدا ہوتی ہیں۔ محبّت کے ذاتی تجربے کے بغیر کسی کے بیان میں ایسا تلخ گداز اور لطیف دردمندی نہیں آسکتی۔ وہ رنگینیٔ طبیعت سے مجبور ہیں۔ ان کے صادق جذبات جوشِ قلب، اور درد و اثر بے ساختہ داد کے قابل ہیں۔ اور کلام میں عشق کی پستی نہیں بلکہ بلندی اور پختگی پائی جاتی ہے۔

اختر شیرانی جوان ہوتے ہیں۔ یہ وہ عالم ہے جس میں ہر شخص عشق و محبّت کرتا ہے۔ یا خود کو عاشق سمجھ بیٹھتا ہے۔ ایک لڑکی سے محبت ہوتی ہے۔ ملاقاتیں ہوتی ہیں عہد و پیمان ہوتے ہیں ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہ رہنے کی قسمیں کھاتے ہیں مگر ہمارے ملک کے رواج کے مطابق ایک دوسرے سے جدا کر دئے جاتے ہیں۔ اور ایسا ہمیشہ ہی ہوتا رہا ہے۔

بس زندگی کی رو بدل جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ سب کچھ بدل جاتا ہے مگر دلوں میں ایک درد اور ایک کسک ہمیشہ بنی رہتی ہے۔ شاعران ہی تجربات اور محسوسات کو وسعت دیتا ہے۔ اور انھیں تمام عالم کے تجربات اور محسوسات بنا دیتا ہے گویا ذاتی چیز کائناتی شے بن جاتی ہے۔

چنانچہ اختر شیرانی 'سلمیٰ' کا چہرہ ماہتابی (جس کے ساتھ انھیں میلِ خاطر تھا) کبھی نہیں بھول سکتے۔ بلکہ اس کی یاد میں عمر بھر کھوئے رہتے ہیں۔ خواب میں بھی اس کے نام پر چونک پڑتے ہیں بقول میر صاحب

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے

ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

اختر شیرانی کی محبوبہ سلمیٰ ہے۔ اپنے اپنے محبوبوں کی تعریف و توصیف میں تقریباً تمام ہی شعرأ نے آسمان و زمین کے قلابے ملائے ہیں۔ اختر شیرانی نے بھی اپنی بیشتر رومانی نظموں میں اپنی محبوبہ سلمیٰ کی تعریف کی ہے۔ لیکن ان کا طرز جدا، اور ان کا انداز علیحدہ اور ممتاز ہے۔ ثبوت کے لئے ان کی ایک نظم کے دو بند ملاحظہ ہوں ۔:۔

بہارِ حسن کا تو غنچۂ شاداب ہے سلمیٰ

تجھے فطرت نے اپنے دستِ رنگیں سے سنوارا ہے بہشتِ رنگ و بو کا تو سراپا اک نظارہ ہے

تری صورت سراسر پیکرِ مہتاب ہے سلمیٰ

شبستانِ جوانی کا تو اک زندہ ستارا ہے تو اس دنیا میں بحرِ حسنِ فطرت کا کنارا ہے

تو اس سنسار میں اک آسمانی خواب ہے سلمیٰ

حکیم نیّر واسطی اپنی کتاب "اختر و سلمیٰ" میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ :۔

" سلمیٰ ، شاعر کی کوئی خیالی محبوبہ نہیں ہے بلکہ اس سنسار کی ایک جیتی اور جاگتی حسینہ ہے جس سے شاعر کو انتہائی محبت یعنی عشق ہے۔ "

سلمیٰ بھی اختر کو جی ، جان سے چاہتی تھی لیکن سماج نے مجبور کر دیا اور شاعر کو تمام عمر غم مفارقت برداشت کرنا پڑا جو اس کے لئے ناقابلِ برداشت تھا چنانچہ شاعر نے اپنی زندگی کی تلخیوں کو شراب کی تلخی میں سمونا چاہا۔ اور شراب نوشی کی حد کر دی۔ مگر سلمیٰ ، ان کی شاعری کے جسم کی روحِ رواں بن گئی۔ اور ان کے مزاج میں عاشقانہ وارفتگی اور والہانہ لذاختگی پیدا ہو گئی چنانچہ ملاحظہ فرمائیے کہ کس طرح اپنی محبوبہ سے خطاب فرما رہے ہیں :۔

اگر مجھے نہ ملیں تم ، تمھارے سر کی قسم

میں اپنی ساری جوانی تباہ کر لوں گا

اختر کے تیور اور لہجہ قابلِ ملاحظہ ہیں۔ ان کے لئے "سلمیٰ" دنیائے حسن کی ایک ملکہ ہے اس کی واقعی محبوبہ ہے اس سے سچی اور پاک محبت ہے کوئی بازاری معشوقہ و محبوبہ نہیں ہے اسی لئے دل کھول کر وہ اس کی تعریف کرتا ہے۔ کبھی اسے عذرا بتاتا ہے اور کبھی ریحانہ کہتا ہے۔ ؎

شہیرِ جلوۂ دیدار کر دیا تو نے نظر کو محشرِ انوار کر دیا تو نے

بہار و خواب کی تنویرِ مرمریں عذرا

شراب و شعر کی تفسیرِ مرمریں عذرا

وہ عورت کا عاشق ہی نہیں بلکہ اس کا پرستار ہے اور اس پر مٹنے ہی کو اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہے

بقیہ صفحہ ۹۳ پر

آنجہانی ماسٹر رام نواس ندیمؔ

ایم اے - اردو فارسی